آپ نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرلیا!

اللہ آپ کو مبارک کرے !!

یہ دراصل علم کی دنیا میں 'داخلہ' (انٹرنس) کا مرحلہ ہے اور اب آپ کو طے کرنا ہے کہ کیا آپ محض دنیاوی علم حاصل کرنے پر اکتفا کریں گے یا دینی اور دنیوی علوم کے حصول کو ترجیح دے کر بالغ نظری کا ثبوت دیں گے!

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے قائم کردہ

قرآن کالج لاہور

میں آپ صاف ستھرے ماحول اور دینی فضا میں قرآن کی ہدایت اور عربی زبان کی تحصیل کے ساتھ ساتھ ایف اے اور بی اے کرسکیں گے۔ ایک محدود تعداد میں عمدہ سہولتوں اور دینی تربیت کے ساتھ ہاسٹل کی سہولت بھی موجود ہے ● داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ: ۲۹ جولائی ۹۳ء، ● انٹرویو: ۳۱ جولائی ● آغاز تدریس ۳ اگست۔ دس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں یا خود تشریف لاکر معلومات حاصل کریں

پرنسپل قرآن کالج، اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، فون ۵۸۳۳۶۳۸ / ۵۸۳۳۶۳۷

نوٹ: (۱) انٹرویو، قرآن کالج میں ۳۱ جولائی کو صبح ۹ بجے ہوگا، جو طلبہ بروقت درخواست داخلہ جمع نہ کراسکیں وہ اپنی درخواست کے ساتھ براہ راست انٹرویو میں شریک ہوسکتے ہیں۔

(۲) وسط جولائی تک جن طلبہ کا رزلٹ ڈیکلیئر نہ ہو، وہ بھی داخلے کی درخواست دے سکتے ہیں۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیرِ اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۲ | محرم الحرام ۱۴۱۴ھ جولائی ۱۹۹۳ء | شمارہ ۷

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور-۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱-داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی، فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۴۰ روپے فی شمارہ -/۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

اسلامک جنرل نالج ورکشاپ

احباب اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ قرآن کالج کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے تعلیمی منصوبوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ قرآن کالج میں جہاں ایف اے اور بی اے کی نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کو بنیادی دینی تعلیم کا ایک نصاب پڑھایا جاتا ہے وہاں گزشتہ کئی برسوں سے اس کالج کی ایک یہ روایت بھی رہی ہے کہ یہاں میٹرک اور انٹر کے امتحانات سے فارغ طلبہ کے لئے ایک یا دو ماہ کے دورانئے پر مشتمل "اسلامک جنرل ورکشاپ" کا انعقاد کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ اپنے فارغ اوقات کا بہتر استعمال کرتے ہوئے دین کی کچھ بنیادی باتیں سیکھ سکیں۔ اس سال بھی اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ۸ مئی تا ۱۶ جون ۹۳ء ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس ورکشاپ کی ایک مختصر رپورٹ جسے ہمارے ایک ساتھی حافظ محمد ابراہیم صاحب' معلم قرآن کالج نے مرتب کیا ہے' ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے:

"اس مرتبہ کورس کی تشہیر اگرچہ بھرپور طریقے پر نہیں جا سکی تاہم ایک ہفتہ قبل اخبار میں ایک مختصر اشتہار دے دیا گیا تھا اور قرآن اکیڈمی اور دارالسلام باغ جناح کے جمعے کے اجتماعات میں پروگرام کے ہینڈ بل تقسیم کئے گئے۔ پھر بھی ہمارے اندازے کے مطابق گزشتہ ورکشاپ کے مقابلے میں داخلے کی صورت حال کافی بہتر تھی۔ کل ۲۹ طلبہ نے داخلہ لیا۔ جس میں سے ۲۵ طلبہ باقاعدگی سے کلاس میں شریک رہے۔ ان ۲۵ طلبہ میں سے ۴ طلبہ نے ہاسٹل میں رہائش رکھی جن سے ۳ کا تعلق آزاد کشمیر سے اور ایک کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ باقی ۲۱ طلبہ میں سے ایک روزانہ شیخوپورہ سے تشریف لاتے رہے۔ جبکہ ۲ طلبہ کا تعلق ساہیوال سے تھا لیکن وہ لاہور ہی میں اپنے عزیزوں کے ہاں مقیم رہے۔ باقی تمام یعنی ۱۸ طلبہ کا تعلق لاہور کے مختلف علاقوں سے تھا۔ ان ۲۵ طلبہ میں سے ۱۷ میٹرک کا امتحان دیکر آئے تھے۔ جبکہ ۶ طلبہ نے ایف اے اور آئی کام وغیرہ کا امتحان دیا تھا۔ دیگر طلبہ میں سے ایک بی کام کے طالب علم تھے۔ ۲۷ مئی ۹۳ء تک (عیدالاضحیٰ سے قبل

تک) یہ تمام طلبہ باقاعدگی کے ساتھ کلاسوں میں شرکت کرتے رہے لیکن عید کی چھٹیوں کے بعد ان میں سے چھ طلبہ دوبارہ کلاس میں حاضر نہ ہو سکے گویا کل ۱۹ طلبہ باقاعدگی سے آخر دن تک شریک ورکشاپ رہے۔

اس جنرل نالج ورکشاپ میں درج ذیل مضامین کا مطالعہ کروایا گیا۔

۱۔ تجوید: جس میں آخری دس سورتوں کا حفظ اور نماز کی اصلاح بھی شامل تھی۔

۲۔ عربی گرائمر: (حصہ اول) صرف جملہ اسمیہ تک (لطف الرحمٰن خان صاحب کی کتاب سے)

۳۔ قرآن حکیم کے منتخب مقامات کی تشریح: بذریعہ لیکچرز۔ (ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مرتب کردہ کتاب 'منتخب نصاب' سے)

۴۔ مطالعہ لٹریچر: محترم ڈاکٹر صاحب کی درج ذیل ۴ کتب کا مطالعہ کروایا گیا:

(i) نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں (ii) قرآن مجید اور ہماری ذمہ داریاں (iii) جب رسول اور اس کے تقاضے اور (iv) فرائض دینی کا جامع تصور۔

۵۔ ارکان اسلام کا مطالعہ: اس کے ضمن میں مولانا مودودیؒ کی کتاب خطبات کے چیدہ چیدہ حصوں کا مطالعہ کروایا گیا۔

اس کورس کے لئے طریقہ امتحان یہ رکھا گیا کہ جونہی کسی مضمون کا ایک مخصوص حصہ مکمل ہوتا تو اس کا امتحان اگلے ہی دن معروضی انداز میں لے لیا جاتا۔ اس طرح کل ۱۳ امتحانات ہوئے۔ منتخب نصاب کے تین' مطالعہ لٹریچر کے چار' خطبات' عربی گرائمر اور تجوید کے دو' دو۔ کم و بیش ۱۵ طلبہ باقاعدگی سے امتحانات میں شرکت کرتے رہے۔ جن میں سے ۱۰ طلبہ نے اچھے نمبروں میں کامیابی حاصل کی۔

الوداعی تقریب

۱۵ جون ۹۳ء کو کالج کی طرف سے ورکشاپ کے شرکاء کی الوداعی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں مہمان خصوصی تھے جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' جبکہ کالج کا تمام اسٹاف بھی مدعو تھا۔ سوا گیارہ بجے تلاوت کلام پاک سے اس تقریب کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں پہلے کالج سٹاف کا ورکشاپ کے شرکاء سے تعارف کروایا گیا اور پھر

تمام شرکائے ورکشاپ نے اپنا اپنا تعارف مہمان خصوصی سے کرایا۔ تعارف کے اس پروگرام کے بعد ورکشاپ کے بارے میں مذکورہ بالا تفصیلات بیان کی گئیں۔ اور پھر شرکائے ورکشاپ کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک نوجوان ساتھی نے اپنے تاثرات بیان کئے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں معاشرے کی دین سے دوری اور نظام تعلیم میں عربی زبان اور دینی تعلیم نہ ہونے کا حوالہ دیا' اور اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ یہ ورکشاپ منعقد کی گئی جو بہت مفید رہی۔ انہوں نے اس کا دورانیہ بڑھانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا اور مضامین کو وسعت دے کر تفصیل کے ساتھ پڑھانے کی تجویز بھی دی۔ آخر میں مہمان خصوصی کا خطاب ہوا۔ انہوں نے سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی ۴ آیات اور حدیث "**خیر کم من تعلم القرن و علمہ**" کے حوالے سے طلبہ کو بتایا کہ کہ سب سے بڑا کیریئر یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو قرآن کا علم حاصل کرنے پر لگائے اور پھر قرآن کو بیان کرنے میں اپنی زندگی کھپا دے۔ بعد ازاں شرکائے ورکشاپ میں قرآن کالج کا پراسپکٹس تقسیم کیا گیا۔ دعا پر اس محفل کا اختتام ہوا۔ سب سے آخر میں تمام شرکائے ورکشاپ اور مہمان گرامی طعام میں شریک ہوئے جو اس الوداعی تقریب کا آخری پروگرام تھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تدریس کرنے والے اصحاب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور شرکائے ورکشاپ نے جو کچھ سیکھا اور سمجھا اس پر عمل کرنے کی ان کو توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)"

☆ ☆ ☆

زیر نظر شمارے میں 'عظمت قرآن' 'بزبان قرآن و صاحب قرآن' کے عنوان سے ایک وقیع مضمون شامل ہے جو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایک خطاب پر مشتمل ہے۔ یہ موضوع محترم ڈاکٹر صاحب کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہے' اور کیوں نہ ہو کہ قرآن حکیم کی عظمت کا ان کے قلب پر گہرا نقش اور اس بارے میں ان کا شدید احساس ہی تو ہے کہ جس کے زیر اثر ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اور بہتر صلاحیتیں قرآن پڑھنے اور پڑھانے اور دوسروں کو قرآن حکیم کی جانب متوجہ کرنے میں صرف ہوئی ہیں۔ یہ مضمون اس سے قبل ماہنامہ میثاق' میں شائع کیا جا چکا ہے لیکن 'حکمت قرآن' کے ساتھ اس کا جو تعلق بنتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اور افادہ عام کے خیال سے اسے 'حکمت قرآن' کے صفحات میں بھی جگہ دی جا رہی ہے۔ ○

عظمتِ قرآن

بزبانِ قرآن وصاحبِ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

اَمّابعد۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ○

صدق الله العظیم

حضرات! میری آج کی یہ گفتگو دو حصوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلے حصے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ تعلیم و تعلّمِ قرآن یعنی قرآن حکیم کے پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے کی کیا اہمیت ہے۔ اور دوسرے حصے میں مجھے اپنے موجودہ حالات کے حوالے سے رُجوع الی القرآن یعنی قرآن حکیم کی طرف از سرِ نو راغب ہونے کی اہمیت کو بیان کرنا ہے۔ پہلے مضمون کے ضمن میں میں نے اس وقت سورۃ الرحمٰن اور سورۃ عبس کی چار چار آیات کی تلاوت کی ہے۔ ان کے حوالہ سے میں چاہوں گا کہ قرآن مجید کی جو عظمت ہمارے سامنے آتی ہے اس پر ہم غور کریں۔ اور اسی ضمن میں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند احادیث بھی آپ کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ عظمتِ قرآن کا بیان جہاں ہم خود اللہ تعالیٰ سے سمجھیں وہاں نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے بھی یہ بات ہمارے

سامنے آئے کہ اس کلام کی کیا عظمت ہے۔ فارسی کا ایک مصرعہ ہے ع "قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری" یعنی موتی اور ہیرے کی قدر و قیمت کو جاننے والا یا تو بادشاہ ہوتا ہے اور یا جوہری! ایک عام دیہاتی کے ہاتھ پر اگر آپ ایک ہیرا یا قیمتی موتی رکھ دیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسے کانچ کا ایک ٹکڑا سمجھے۔ تو اسی طریقے پر قرآن مجید کی عظمت سے اصلاً تو وہ ہستی واقف ہے جس کا یہ کلام ہے اور پھر دوسرے نمبر پر اس کی عظمت سے صحیح معنوں میں واقف وہ ہستی ہے کہ جس پر یہ قرآن نازل ہوا یعنی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی چار آیات بڑی مختصر ہیں۔ پہلی آیت صرف ایک لفظ پر مشتمل ہے: اَلرَّحْمٰنُ ○ اس کے بعد کی تین آیات دو دو الفاظ پر مشتمل ہیں: عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○ لیکن اگر ہم ان الفاظ پر تدبّر کریں' غور و فکر کریں' سوچ و بچار سے کام لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان مختصر ترین الفاظ میں جو مضامین پنہاں ہیں ان مضامین کا بیان کرنا کسی ایک تقریر میں ممکن ہی نہیں۔ ہر اعتبار سے ایک چوٹی کا مضمون ہے جو ہر آیت میں آیا ہے۔

پہلی آیت جیسا کہ میں نے عرض کیا صرف ایک لفظ "اَلرَّحْمٰنُ" پر مشتمل ہے۔ الرحمٰن اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں اللہ کے بہت سے نام وارد ہوئے ہیں اور حدیث شریف میں بھی ان کا ذکر ہے۔ ویسے تو قرآن مجید سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ "فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى" یعنی جتنے بھی اچھے نام ہیں سب اللہ کے ہیں۔ جتنی اچھی صفات کا ہم تصور کر سکتے ہیں وہ تمام صفات ذات باری تعالیٰ میں بتمام و کمال موجود ہیں۔ جس اچھائی' جس خوبی' جس خیر اور جس کمال کا ہمارے ذہن میں خیال آ سکتا ہے وہ اللہ پاک کی ذات میں موجود ہے۔ لیکن تعیّن کے ساتھ اللہ پاک کے نام وہی ہیں جو قرآن مجید میں یا حدیث شریف میں وارد ہوئے ہیں۔ ان ناموں میں سب سے زیادہ محبوب نام "اللہ" ہے اور اس سے قریب ترین نام "رحمٰن" ہے۔ چنانچہ تلاوتِ قرآن مجید کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے کیا جاتا ہے۔ پھر سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت کے الفاظ بھی یہ ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اور دوسری آیت ہے: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

واقعہ یہ ہے کہ لفظ "اللہ" تو عرب میں بہت معروف تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی اہل عرب "اللہ" کے نام سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اللہ سے دعائیں کرتے تھے اور اپنے تمام شرک کے باوجود اس حقیقت کو مانتے تھے کہ اس کائنات کے تخلیق کرنے میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس پوری کائنات کا خالق تنہا وہی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے: "وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ" (لقمان: ۲۵) کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ ان سے سوال کریں کہ یہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کئے تو وہ لازماً کہیں گے کہ اللہ نے! لیکن اللہ تعالیٰ کے دوسرے ناموں میں سب سے زیادہ نمایاں اور ایک خاص پہلو سے سب سے زیادہ پیارا نام جو ہے وہ "رحمٰن" ہے۔ قرآن مجید میں جب یہ نام بار بار آیا تو اہل عرب نے اعتراض کیا کہ یہ "رحمٰن" کون ہے؟ سورۂ بنی اسرائیل کے آخر میں فرمایا گیا: "قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى" کہ اے نبیؐ! ان سے کہئے: چاہے اللہ کہہ کر پکار لو' چاہے رحمٰن کہہ کر پکار لو' پس یہ جان لو کہ جس کو پکار رہے ہو تمام اچھے نام اسی کے ہیں! تو اس سے بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے "اللہ" کے قریب ترین جو نام آتا ہے' وہ "رحمٰن" ہے۔

لیکن میں نے جو عرض کیا کہ ایک دوسرے پہلو سے یہ سب سے زیادہ پیارا نام ہے تو اس بات کو بھی سمجھ لیجئے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ صفاتی نام اس کی صفتِ رحمت سے بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت وہ صفت ہے جس کے ہم سب سے زیادہ محتاج ہیں۔ اور ہمارا معاملہ تو بہت دُور کی بات ہے' خود نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ضرورت مند ہیں۔ ایک بار آپؐ نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے کوئی بھی محض اپنے عمل کی بنا پر جنت میں داخل نہ ہو سکے گا"۔ اس پر کسی صحابیؓ نے ہمت کر کے یہ سوال کر لیا کہ: "حضورؐ کیا آپ بھی نہیں؟" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ہاں' میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنے خصوصی فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے!" (متفق علیہ۔ عن ابی ہریرہؓ) اب آپ اندازہ کیجئے کہ اگر اللہ کے نبیوں اور پیغمبروں کو اور سید المرسلین سید الاولین والآخرین محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتِ خداوندی کی احتیاج ہے تو ہم اس سے کس طرح مستغنی ہو سکتے ہیں؟ ہم سب اللہ

تعالیٰ کی رحمت کی شدید احتیاج رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر آتا ہے: "یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ" (فاطر: ۱۵) کہ اے لوگو! تم سب کے سب اللہ کی ذات کے فقیر ہو' محتاج ہو! غنی اور حمید ذات تو صرف اسی کی ہے!!۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام جب مصر سے جان بچا کر نکلے اور پا پیادہ پورا صحرائے سینا عبور کر کے تنِ تنہا مدین پہنچے تو آبادی کے باہر کنوئیں پر بیٹھ گئے۔ آپؑ اس وقت انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تھے' وہاں آپؑ کی کوئی جان پہچان تک نہ تھی۔ اس حال میں موسیٰ علیہ الصلاۃ و السلام کی زبان مبارک پر جو دعا آئی وہ قرآن حکیم میں بایں الفاظ منقول ہے: "رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ" (پروردگار میں ہر اس خیر کا محتاج ہوں جو تو میری جھولی میں ڈال دے) اور واقعہ یہ ہے کہ مخلوق کا معاملہ اللہ کے سامنے اسی فقر اور احتیاج کا ہے' اور ہم رحمتِ خداوندی کے ہر آن محتاج ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اس صفتِ رحمت سے اس کے دو نام بنے ہیں: رحمٰن اور رحیم! اور یہ واحد صفت ہے جس سے اللہ کے دو نام آتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ان میں رحمت کی دو شانوں کا ظہور ہو رہا ہے۔ "رحیم" فعیل کے وزن پر صفتِ مشبّہ ہے جو اس کیفیت کو ظاہر کر رہا ہے جو اس دریا کی مانند ہے جو مسلسل بہہ رہا ہو --- جس میں سکون' دوام اور پائیداری ہو اور "رحمٰن" رحمت خداوندی کی اس شان کو ظاہر کرتا ہے جو ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہے' جس میں ایک ہیجان کی کیفیت ہے۔ فَعلان کے وزن پر عربی زبان کے جو الفاظ بھی آتے ہیں ان میں یہ شدّت پائی جاتی ہے۔ ایک ہیجانی اور طوفانی کیفیت ان کا خاصہ ہے۔ عرب کہے گا: "اَنَا عَطْشَانُ" کہ میں بہت پیاسا ہوں۔ یعنی پیاس سے جان نکل رہی ہے۔ بھوک سے کوئی شخص مر رہا ہے تو وہ کہے گا: "اَنَا جَوْعَانُ" اسی طرح "غَضْبَانُ" کے معانی ہیں بہت زیادہ غضبناک۔ تو اسی طریقہ سے یہ لفظ "رحمٰن" بنا ہے یعنی انتہائی رحم فرمانے والا' جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت گویا کہ انتہائی پیاری اور محبوب صفت ہے' اور اس میں بھی شان رحمانیت ایک عجیب کیفیت کی حامل ہے۔

اسی شانِ رحمانیت کے حوالے سے فرمایا گیا:

الرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○

"اس رحمٰن نے تعلیم دی ہے قرآن کی!"

قرآن کی عظمت کو اس سے سمجھو کہ اس کا تعلق اللہ کی صفتِ رحمانیت سے ہے۔ اگر فرمایا جاتا: "اَللّٰہُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ"۔ تو بھی بات مکمل ہو جاتی' لیکن قرآن کا ذکر اللہ پاک کی صفتِ رحمانیت کے حوالے سے ہو رہا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ: جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے' اس نے قرآن سکھایا۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اللہ نے صرف قرآن نہیں سکھایا' اس نے تو انسان کو بہت کچھ سکھایا ہے۔ انسان کے پاس جو بھی علم ہے' وہ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ سورۃ البقرہ کی ابتداء میں حضرت آدمؑ کا جو قصہ بیان ہوا ہے' اس میں فرمایا گیا: "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا" اور اس موقع پر فرشتوں کا جواب یہ تھا: "سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا" (تو پاک ہے' ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اس کے جو تُو نے ہمیں عطا کیا)۔ تو جن و انس ہوں' ملائکہ ہوں' انبیاء و رسل ہوں' اولیاء اللہ ہوں' یا بڑے سے بڑا سائنسدان اور بڑے سے بڑا فلسفی ہو' جس کے پاس بھی علم کی کچھ رمق موجود ہے' وہ آخر کہاں سے آتی ہے؟ آیۃ الکرسی میں فرمایا گیا: "وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ" کہ مخلوق میں سے کوئی اس کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتا' سوائے اتنے حصّے کو جتنا وہ خود کسی کو دینا چاہے۔ بلکہ ایک نومولود بچہ جو دنیا میں آتا ہے' اسے یہ علم ہوتا ہے کہ اس کا رزق کہاں ہے' اس کی روزی کہاں ہے۔ وہ ماں کی چھاتی پر جس طرح منہ مارتا ہے' اس کی تربیت اسے کس نے دی ہے؟ یہ شعور وہ کہاں سے لے کر آیا ہے؟ وہ کون سی تربیت گاہ تھی جہاں سے وہ یہ ٹریننگ لے کر آیا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ علم خواہ جبلّی ہو' خواہ فطری ہو' خواہ وہ ہمارے نفس میں ودیعت شدہ ہو اور خواہ وہ ہم تعلیم کے نظام کے ذریعے سے حاصل کرتے ہوں' اس کا منبع اور سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اور ہمیں سبھی کچھ اسی نے سکھایا ہے۔ لیکن اس نے جو کچھ سکھایا ہے' اس میں چوٹی کی چیز قرآن ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے بہت بلند صفت ہے رحمت ـــــ اور اس رحمت کی بہت بلند شان ہے جو لفظ "رحمٰن" میں ظاہر ہوتی ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو کچھ سکھایا ہے' اس میں سب سے چوٹی کی چیز جس کی تعلیم دی' وہ قرآن حکیم ہے: اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ○

اب تیسری آیت پر آیئے۔ فرمایا:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ "انسان کی تخلیق فرمائی"۔

یہاں پھر وہی بات سامنے آتی ہے۔ اللہ نے صرف انسان کی تخلیق نہیں فرمائی' جنوں کو بھی اسی نے تخلیق فرمایا' ملائکہ کی تخلیق بھی اسی نے فرمائی' یہ شجر و حجر جو ہیں' یہ بھی اسی کے تخلیق کردہ ہیں' یہ چاند اور سورج بھی تو اسی نے پیدا کئے۔ لیکن یہاں امتیازی طور پر انسان کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے۔ آج ہمارے سائنسی اور مادی علوم کا نتیجہ اور ماحصل بھی یہی ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے جمادات تھے' جمادات کے بعد نباتات اور نباتات کے بعد حیوانات آئے۔ پھر جمادات کے مقابلہ میں نباتات ایک اعلیٰ خلقت کی حامل ہیں۔ نباتات کے اوپر حیوانات کا سلسلہ ہے' اور وہ ایک مزید اعلیٰ درجہ کی تخلیق ہے۔ حیوانات میں اگر ارتقاء (EVOLUTION) کے نظریے کو تسلیم کیا جائے تو انسان کا مقام شجرِ ارتقاء (EVOLUTION TREE) کی چوٹی پر ہے۔ گویا کہ یہ سلسلۂ تخلیق کا نقطۂ عروج ہے۔ اور قرآن سے بھی اس کی گواہی ملتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۷۰) میں فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○

"اور ہم نے بنی آدم کو عزت اور اکرام عطا فرمایا ہے' اور ان کو بحر و بر میں سواریاں دیں' اور پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا فرمایا' اور جتنی مخلوقات ہم نے پیدا کیں' ان میں سے اکثر پر انہیں فضیلت عطا فرمائی"۔

سورۂ صٓ میں فرمایا:

"خَلَقْتُ بِيَدَيَّ" (میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا)

تورات میں بھی اس طرح کے الفاظ آتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔ یہ الفاظ اگرچہ قرآن میں نہیں ہیں' لیکن حدیث صحیح میں موجود ہیں:

"خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ" (متفق علیہ: عن ابی ہریرہؓ)

(اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق فرمایا)

اس کے لئے اب مزید دلائل کی ضرورت نہیں۔ سورۃ الرحمٰن کی پہلی تین آیات سے ہم

نے تین باتیں سمجھی ہیں: (i) صفاتِ باری تعالیٰ میں سے چوٹی کی صفت ——— رحمٰن۔ (ii) اللہ نے انسان کو جو علم عطا فرمایا' اس میں چوٹی کا علم ——— قرآن۔ (iii) جو کچھ اس نے پیدا فرمایا اس میں چوٹی کی تخلیق ——— انسان۔

اب چوتھی آیت آتی ہے:

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○

"انسان کو اس نے بیان کی تعلیم عطا فرمائی!"

اب ذرا غور کیجئے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ ان میں سے قوتِ بیان کا حوالہ کس اعتبار سے دیا گیا ہے؟ واقعہ یہ ہے ہم میں جو بھی جسمانی صلاحیتیں ہیں' وہ اکثر و بیشتر دیگر حیوانات میں بھی ہیں۔ ہم کھانا کھاتے ہیں' اور جو کچھ کھاتے ہیں اسے ہضم کرتے ہیں۔ یہ نظامِ ہضم حیوانات میں بھی ہے۔ ہم میں اگر جنس کا مادہ رکھا گیا ہے اور توالد و تناسل کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے تو یہ حیوانات میں بھی ہے۔ ہمیں اگر بینائی عطا کی گئی ہے تو آپ کو پرندوں میں ایسے پرندے بھی مل جائیں گے جن کی بینائی ہم سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ مثلاً بلندی پر پرواز کرتا ہوا عقاب زمین پر پڑی ہوئی سوئی تک دیکھ لیتا ہے۔ اب ایسے آلے بھی ایجاد کر لئے گئے ہیں جن کی بینائی ہماری بینائی سے کہیں زیادہ ہے۔ کتنے ہی حیوانات ہیں جن کی قوتِ شامہ یعنی سونگھنے کی قوت ہم سے کہیں بڑھ کر ہے۔ تو یہ استعدادات جو ہمارے اندر ہیں' حیوانات میں بھی ہیں۔ البتہ ایک صفت وہ ہے جس کے اعتبار سے اہلِ فلسفہ اور اہلِ منطق نے انسان کو دیگر حیوانات سے ممیز قرار دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ اس کو نطق و گویائی کی صفت عطا کی گئی ہے۔ اسے اظہار مافی الضمیر کے لئے زبان دی گئی ہے۔ وہ زبان جو اس کے باہمی تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنتی ہے۔ انسانی دماغ کی ساخت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام حیوانات کے مقابلے میں انسانی دماغ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں سب سے بڑا حصہ مرکزِ تکلم (Speech Centre) ہے' جو تمام حیوانات کی نسبت سب سے زیادہ ترقی یافتہ (DEVELOPED) ہے۔ چنانچہ یہاں انسان کی سب سے امتیازی صلاحیت کا حوالہ دیا گیا کہ ہم نے اسے قوت بیانیہ عطا کی۔

اب ان چار آیات کا ماحصل ایک بار پھر اپنے سامنے رکھئے:

اَلرَّحْمٰنُ: صفاتِ باری تعالیٰ میں سے چوتھی کی صفت۔
عَلَّمَ الْقُرْآنَ: رحمٰن کی طرف سے سب سے بڑی دولت اور نعمت جو انسان کو عطا کی گئی وہ یہ ہے کہ اسے قرآن سکھایا گیا۔
خَلَقَ الْاِنْسَانَ: اللہ نے انسان کو پیدا کیا جو اس کی تخلیق کا نقطۂ کمال ہے۔
عَلَّمَہُ الْبَیَانَ: انسان کو اس نے جو صلاحیتیں دی ہیں ان میں سب سے اونچی صلاحیت اس کے بیان کی قوت ہے۔

یہ چار آیات تین جملوں پر مشتمل ہیں' جن کا ترجمہ یہ ہوگا:

(i) رحمٰن نے قرآن سکھایا۔
(ii) اس نے انسان کو تخلیق فرمایا۔
(iii) اسے قوتِ بیان عطا فرمائی۔

اب ذرا غور کیجئے کہ ان تین باتوں سے نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ریاضی میں نسبت و تناسب کے قاعدے سے تین معلوم اقدار کی مدد سے چوتھی قدر کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں چوتھی قدر کا تعین کرنا ہے۔ اور وہ یہ ہوگی کہ انسان کو جو قوت گویائی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے' اس کا بہترین مصرف اگر کوئی ہے تو وہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا اور اس کا سیکھنا سکھانا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو قوتِ بیانیہ دی ہے' یہ انسان کے اوصاف میں سے اعلیٰ ترین وصف ہے۔ اور اس کا بہترین مصرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے اللہ کے کلام کو بیان کیا جائے' اللہ کے پیغامِ ہدایت کو عام کیا جائے' اللہ کے اس کلام کی تبلیغ و اشاعت کی جائے۔

سورۃ الرحمٰن کی تین آیات سے میں نے یہ جو نتیجہ نکالا ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے ثابت ہے' جس کے راوی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس سے ہمیں قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ہمارے ہاں کچھ ایسے محروم لوگ ہیں جو اپنے آپ کو حدیث سے مستغنی سمجھ بیٹھے ہیں اور اس طرح شدید گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے لئے بس قرآن کافی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو سمجھنے اور ان سے استفادہ کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر صرف کتاب کافی ہوتی تو نبیوں اور رسولوں کی بعثت کی

ضرورت نہیں تھی۔ کتاب کے ساتھ ایک معلم ضروری ہوتا ہے۔ آپ اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں چھاپ لیجئے' لیکن آپ کا کیا خیال ہے کہ دنیا کے اندر کوئی نظامِ تعلیم بغیر معلمین کے بنایا جا سکتا ہے؟۔ اکبر الہ آبادی کا بڑا پیارا شعر ہے کہ ۔

کورس تو لفظ ہی پڑھاتے ہیں　　آدمی آدمی بناتے ہیں

کورس پڑھنے سے تو انسان انسان نہیں بنتا۔ انسان تو انسان کے بنانے سے بنتا ہے۔ تعلیم کے لئے معلّم کی ضرورت ناگزیر ہے۔ تو یہ جان لیجئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلّم بن کر آئے۔ حضورؐ نے خود فرمایا: "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" (لوگو! میں تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں)۔ قرآن مجید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ کار کے ضمن میں آپ کو چار جگہ یہ الفاظ ملیں گے:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

"وہ انہیں اللہ کی آیات تلاوت کر کے سناتا ہے' اور ان کا تزکیہ کرتا ہے' اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

تو اللہ کی کتاب' اللہ کے کلام کے معلّم ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ان چار آیات کی جو میں نے اس قدر تفصیل بیان کی ہے' اور ایک ایک لفظ پر اتنا وقت صَرف کرنے کے بعد آپ کو جس نتیجہ پر پہنچایا ہے' جس کے لئے میں نے نسبت و تناسب کے قاعدے کا حوالہ بھی دیا ہے' وہ نتیجہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سادہ سے جملہ میں بیان فرما دیا ہے۔ اس کے راوی حضرت عثمان غنی ذوالنورین ؓ ہیں۔ اور چونکہ میں اسے ان آیات کے ساتھ جوڑ رہا ہوں جن میں چوٹی کے مضامین بیان ہوئے ہیں تو یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث بھی چوٹی کا مقام رکھتی ہے۔ یہ حدیث امام بخاری' امام ترمذی اور امام ابو داؤد (رحمہم اللہ) نے روایت کی ہے۔ صحیح بخاری کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ کتبِ حدیث میں یہ چوٹی کی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کے بارے میں "اَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ" ہونے پر علمائے کرام کا اتفاق ہے۔ یعنی قرآن حکیم کے بعد یہ دنیا کی صحیح ترین کتاب ہے۔ صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث جامع ترمذی اور سُنن ابی داؤد میں بھی موجود ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ

"تم میں سے بہترین وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور اسے (دوسروں کو) سکھایا"۔

یعنی اہلِ ایمان میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں' قرآن پڑھیں اور پڑھائیں۔ اور دیکھئے یہاں "خَیْرُکُمْ" کن سے کہا جا رہا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے! ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرامؓ میں بھی فرقِ مراتب ہے۔ ان میں درجات ہیں۔ ع گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی۔ ہم اہلِ سنّت کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ: اَفْضَلُ الْبَشَرِ بَعْدَ الْاَنْبِیَاءِ بِالتَّحْقِیْقِ' اَبُوْبَکْرِ الصِّدِّیْقُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ' یعنی یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ انبیاء کے بعد افضل البشر ہیں۔ آپؓ کے بعد حضرت عمرؓ کا مقام ہے' پھر حضرت عثمانؓ اور پھر حضرت علیؓ ہیں۔ خلفائے اربعہ کے بعد پھر عشرۂ مبشرہ ہیں۔ رضی اللہ عنہم وارضاہم اجمعین۔ تو ظاہر ہے کہ ع ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مزاج میں بہرحال کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی طبیعت جمالی ہے' حضرت عمرؓ کی جلالی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے اندر رحمت و شفقت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ دین کے معاملات میں بہت شدید ہیں۔ حضرت عثمانؓ میں سچائی اور حیاء کا مادہ بدرجۂ اتم ہے۔ حضرت علیؓ مقدمات کے فیصلے کرنے میں بہت زیرک ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ' وَاَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ' وَاَصْدَقُھُمْ حَیَاءً عُثْمَانُ' وَاَقْضَاھُمْ عَلِیٌّ..... الخ (رواہ الترمذی' عن انس بن مالک)

تو ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں بھی نسبتیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرماتے ہیں:

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ

"تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے (دوسروں کو) سکھائے!"

اس حوالے سے میں خاص طور پر نوجوانوں کے لئے عرض کروں گا کہ ان کے دلوں میں قرآن کو سیکھنے سکھانے کی آرزو اور امنگ پیدا ہونی چاہئے۔ جوانی کا دَور آرزوؤں اور امنگوں کا دور ہوتا ہے لیکن عام طور پر ہم جن آرزوؤں کے پیچھے دوڑتے ہیں ان کا تعلق

اسی دُنیوی زندگی سے ہوتا ہے۔ عمدہ کیریئر' اچھا مکان اور دنیوی آسائشوں کے حصول کی آرزوئیں تو ہر ایک کے دل میں پیدا ہوتی ہیں --- لیکن آپ کے دل میں وہ آرزو پیدا ہونی چاہئے جس کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

وہ کون سی آرزو ہے؟ وہ آرزو ہے ان چیزوں کی آرزو کہ جن سے اس مادہ پرستی کے دور میں ہماری نگاہیں بالکل ہٹ گئی ہیں۔ کاش کہ یہ آرزو پیدا ہو جائے کہ ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے نقشِ قدم پر چل سکیں۔ کاش نوجوانوں کے دلوں میں وہ آرزو پیدا ہو کہ اللہ ہمیں جناب ارقمؓ یا معصب بن عمیرؓ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے دے۔ یہ دو نام میں نے آپ کو اس لئے سنائے ہیں کہ یہ دونوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھتے تھے اور پھر جا کر دوسروں کو سکھاتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مکہ میں حالات بڑے دگرگوں اور نامساعد تھے۔ کفر و شرک کا غلبہ تھا۔ کوئی مسجد تو ایسی نہ تھی جہاں حضورؐ تشریف فرما ہوں اور صحابہ کرامؓ کو تعلیم دیں۔ ایسا تو ممکن ہی نہ تھا۔ ایک حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کا گھر تھا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو تعلیم دیتے اور ظاہر بات ہے کہ سب لوگ وہاں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ لوگوں کی اپنی مصروفیات بھی ہوتیں۔ پھر یہ کہ اگر محسوس ہو جاتا کہ یہاں مرکز بن گیا ہے تو مخالفت شدید ہو جاتی۔ ان حالات میں تعلیم کا طریقِ کار یہ تھا کہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کر دیا تھا کہ وہ حضورؐ کی صحبت میں رہتے تھے۔ جیسے ہی وحی نازل ہوتی' وہ اسے سیکھ لیتے اور پھر اہلِ ایمان ان کے گھروں پر جا کر اس وحی کو پہنچاتے تھے۔ اس طریقے سے قرآن کے علم کی تبلیغ جاری تھی۔

انہی نوجوانوں میں سے ایک صحابی حضرت خباب بن ارتؓ تھے۔ یہ وہ صحابیؓ ہیں کہ جن کو دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا گیا اور ان کی کمر کی چربی پگھلنے سے وہ انگارے ٹھنڈے ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد انہیں ایسی ایسی سختیاں جھیلنی پڑی ہیں' لیکن وہ اس سب کے باوجود اس کام میں ثابت قدمی سے لگے رہے کہ اللہ کا جو کلام محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا' وہ آپؐ سے سیکھتے اور لوگوں تک پہنچاتے۔ حضرت عمر

رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا جو واقعہ آتا ہے اس میں بھی حضرت خبابؓ بن ارت کا کردار بہت اہم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے ننگی تلوار لے کر بڑی جلالی کیفیت میں نکلے تھے۔ راستے میں انہیں حضرت حذیفہؓ مل گئے جو اگرچہ ایمان لا چکے تھے' لیکن انہوں نے اپنا ایمان ابھی چھپایا ہوا تھا۔ انہوں نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ کہا: میں آج محمدؐ کو قتل کر کے چھوڑوں گا' اب یہ قصہ چکا دینا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)۔ حضرت حذیفہؓ نے بڑی حکمت سے رُخ موڑ دیا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے جا رہے ہو' پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو' تمہاری ہمشیرہ اور تمہارے بہنوئی دونوں ایمان لا چکے ہیں! اب آپ تصور نہیں کر سکتے کہ اُس وقت عمرؓ کے غیظ و غضب کا کیا عالم ہوگا۔ وہ غصے میں آگ بگولہ اپنی ہمشیرہ حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچے تو وہاں حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ' آپ کی ہمشیرہ اور آپ کے بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما کو سورۂ طٰہٰ کی آیات سکھا رہے تھے۔ کاش ہمارے دل میں بھی یہی جذبہ پیدا ہو جائے۔

دوسرا نام میں نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا لیا ہے۔ ان کا ذکر شاید ہمارے دلوں کے اندر کوئی آرزو پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ یہ بڑے لاڈ اور پیار سے پلے تھے۔ ان کے لئے دو دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جوانی کے عالم میں پنڈت جواہر لال نہرو کے کپڑے پیرس سے سِل کر آیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں پہلی کار جو غیر سرکاری طور پر آئی تھی وہ ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو کی تھی۔ اپنی پوتی اندرا گاندھی کی پیدائش پر پنڈت موتی لال نہرو نے پورے الٰہ آباد کے لوگوں کی دعوت کی تھی۔ تو جس طرح یہ بات مشہور تھی کہ جواہر لال نہرو کے کپڑے پیرس سے سِل کر آتے ہیں اور پیرس سے دُھل کر آتے ہیں' اس طرح کا معاملہ تھا حضرت مصعب بن عمیرؓ کا۔ ان کے جوڑے شام سے تیار ہو کر آتے تھے اور لباس اس قدر معطر ہوتا تھا کہ جس راستے سے مصعبؓ گزر جاتے' پورا راستہ معطر ہو جاتا۔ لیکن وہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو ان کے گھر والوں نے ان کے بدن سے سارے کپڑے تک اتار لئے اور انہیں بالکل برہنہ کر کے گھر سے نکال دیا کہ اگر تم نے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے تو باپ کی کمائی میں سے جو کپڑے ہیں' ان پر بھی تمہارا

حق نہیں ہے۔ اس کے بعد دو دو سو درہم کا جوڑا پہننے والے اس نوجوان پر وہ وقت بھی آیا کہ پھٹا ہوا ایک کمبل جسم پر ہے' اور اس میں پیوند لگے ہوئے ہیں۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو تعلیم و تعلّمِ قرآن کے لئے وقف کر دیا۔

انسان کا رُخ جب بدلتا ہے تو اس کی آرزوئیں اور امنگیں بھی بدل جاتی ہیں۔ پہلے وہ اس معاملہ میں آگے تھے اب اس معاملہ میں آگے ہیں۔ اسی کام میں اپنی صلاحیتیں لگا رہے ہیں۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ کے موقع پر ایمان لانے والے مدینہ کے بارہ افراد نے آنحضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمیں اپنے کوئی ایسے ساتھی دے دیجئے جو ہمیں قرآن پڑھائیں۔ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مامور کیا کہ تم مدینہ جا کر وہاں کے لوگوں کو قرآن پڑھاؤ۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ نے وہاں سال بھر قرآن کی تعلیم و تدریس کا کام کیا۔ اور اس عظیم کام کی مناسبت سے وہاں آپ کا نام ہی "مُقرِی" (پڑھانے والا) پڑ گیا۔ لوگ آپ کو دیکھتے تو پکار اٹھتے: "جَاءَ الْمُقْرِی" (وہ پڑھانے والے آ گئے) حضرت مصعب بن عمیرؓ کی سال بھر کی محنت و کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال مدینہ سے ۷۵ اشخاص آئے اور انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ گویا مصعبؓ کی ایک سال کی کمائی تھی۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا ہے تو میں ان کے بارے میں کچھ مزید عرض کر دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے تو ایک روز آپؐ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے اور مصعبؓ دروازے کے سامنے سے گزرے۔ اس وقت ان کے جسم پر ایک پھٹا ہوا کمبل تھا کہ جس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ مصعبؓ اللہ کے دین کے لئے کہاں سے کہاں پہنچا! غزوۂ احد میں جب یہ شہید ہوئے تو اس وقت ان کے جسم پر بس ایک چادر تھی۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ شہید کا کفن وہی لباس ہوتا ہے جس میں اسے شہادت ملے۔ اب تدفین کے وقت یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ مصعبؓ کے جسم پر جو چادر تھی' وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اگر اس سے ان کا سر ڈھانپتے تھے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا۔ یہ مسئلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ان کا سر چادر سے ڈھانپ دو اور ان کے پاؤں پر

گھاس ڈال دو۔ یہ ہے آخری لباس جو مصعب بن عمیرؓ کو ملا۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شکل و صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی مشابہت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب آپ نے جامِ شہادت نوش کیا تو مشہور ہوگیا کہ حضورؐ شہید ہوگئے۔ غزوۂ اُحد میں یہ اسلامی فوج کے علم بردار تھے۔ مسلمانوں کا عَلَم انہی کے ہاتھ میں تھا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس طرح کے واقعات قلب پر گہرا تاثر چھوڑتے ہیں۔ جو بھی مسلمان ہے اگر اس کے سامنے حضرت خبابؓ کی تصویر آئے یا مصعب بن عمیرؓ کی تصویر سامنے آئے تو کیسے ممکن ہے کہ دل پر اثر نہ ہو! لیکن جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ یہاں ان صاحبِ عزیمت ہستیوں کا ذکر کس حوالے سے ہو رہا ہے! کاش اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی یہ آرزو پیدا فرما دے کہ جس طرح انہوں نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیا کہ وہ کلامِ الٰہی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کو عام کریں' اس کو پھیلائیں' اسے دوسروں تک پہنچائیں' اسی طرح اسی کے لئے زندگیاں وقف کرنے کی کوئی امنگ' کوئی آرزو ہمارے دلوں میں بھی پیدا ہو جائے۔

سورۂ عبس کی چار آیات' جن کی آغاز میں تلاوت کی گئی' وہ بھی اسی مضمون کی شرح پر مشتمل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ○ مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍ ○ بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ○ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ ○

ذرا غور کیجئے کہ ان الفاظ میں کس قدر شکوہ ہے۔ کاش کہ قرآن کریم سے ہماری یہ مناسبت بھی پیدا ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کا جو صوتی آہنگ ہے اور اس میں جو ایک ملکوتی غنا اور موسیقی مضمر ہے' اس کی کوئی دوسری نظیر ممکن نہیں۔ ایک موسیقی وہ ہے جس کے ہم عادی ہوگئے ہیں اور ایک یہ ملکوتی موسیقی ہے جو اس قرآن مجید کے صوتی آہنگ میں ہے۔ آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملے ہوں گے جنہیں موسیقی سے ہی کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ کوئی اچھے سے اچھا راگ بھی ہو تو انہیں پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی طریقہ سے ہمارا حال یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم کی ملکوتی موسیقی سے بے بہرہ ہیں۔ اس کائنات میں بہترین موسیقی یہ اللہ کا کلام ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے لئے اس میں کوئی کشش اور دلچسپی نہیں۔ اس پہلو سے قرآن کے ساتھ ہماری

ذہنی و قلبی مناسبت پیدا ہونی چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا ہے کہ:

زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ

"اس قرآن کو اپنی آوازوں سے مزیّن کیا کرو!"

(اس حدیث کے راوی حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ سُنن ابی داؤد اور سُنن نسائی میں وارد ہوئی ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت اچھی آواز عطا کی تھی اور ان کی قراءت کو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے شوق سے سنتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت ان کے گھر کے پاس سے گزرے' اس وقت حضرت ابو موسیٰؓ اپنی خاص کیفیت کے ساتھ قرآن پڑھ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑی دیر تک وہاں کھڑے ہو کر قرآن سنتے رہے اور فجر میں ابو موسیٰ اشعریؓ سے فرمایا: "يَا أَبَا مُوسىٰ! إِنَّكَ قَدْ أُوتِيتَ مِزْمَاراً مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُد" کہ اے ابو موسیٰ! تجھے تو اللہ تعالیٰ نے آلِ داؤد کے سازوں میں سے ایک ساز عطا کیا ہے!۔ حضرت داؤد علیہ الصلاۃ والسلام جب صبح کے وقت زبور کے حمد کے ترانے پڑھا کرتے تھے تو قرآن میں گواہی موجود ہے کہ پرندے بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور پہاڑ بھی وجد میں آ جاتے تھے۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں جو پُرشکوہ صوتی آہنگ اور ملکوتی غناء ہے وہ ان چار آیات میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے:

فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ○ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ○ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ○ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ○

قرآنؐ مجید کی عظمت خود قرآن میں جابجا بیان ہوئی ہے' لیکن آج کی اس نشست میں ہم نے اس کے لئے سورۂ رحمٰن اور سورۂ عبس کی چار چار آیات کا انتخاب کیا ہے۔ یہاں سورۂ عبس میں اس قرآن مجید کے بارے میں فرمایا گیا:

فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ○

"یہ کتاب بڑے باعزت صحیفوں میں ہے"۔

یہ لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔ یہاں دنیا میں تو اس کا ایک عکس ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اصل کتاب تو لکھی ہوئی ہے لوحِ محفوظ میں:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ○ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ○

ایک دوسری جگہ فرمایا:

فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ○ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ○

کہ یہ کتاب تو "مکنون" ہے جیسے کسی بہت ہی قیمتی ہیرے کو ڈبیہ میں بند کر کے ڈبیہ کو کسی بکس میں رکھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اسے صرف وہی چھوتے ہیں جو انتہائی پاک و طیب ہیں' یعنی فرشتے۔ اس وقت ان سب آیات کی تشریح ممکن نہیں ہے۔ میں صرف سورۂ عبس کی آیات کا ترجمہ کر رہا ہوں۔ ان باعزت صحیفوں کے بارے میں فرمایا:

مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ○

"بہت ہی رفیع الشان اور بہت ہی پاک کئے ہوئے (صحیفے ہیں)"۔

اور کن کے ہاتھوں میں ہیں؟

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ○ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ○

"ان لکھنے والوں کے ہاتھوں میں' جو بڑے بلند مرتبہ اور نیکوکار ہیں"۔

اب ان آیات سے متعلق ایک حدیث سن لیجئے۔ سورۃ الرحمٰن کی چار آیات کا خلاصہ بھی میں نے آپ کو حدیث شریف سے سنایا ہے۔ اور ان چار آیات کا خلاصہ بھی حدیث میں ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس کی راویہ ہیں۔ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن کا ماہر ہو جائے' اس کو صحیح طور پر پڑھتا ہو' اس کو سمجھتا ہو' اس کا رتبہ بھی ان فرشتوں کا سا ہے جن کے لئے سورۂ عبس میں "سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی لوحِ محفوظ میں قرآن کو لکھنے والے بلند مرتبہ نیکوکار فرشتوں کا جو مقام و مرتبہ ہے' وہی رتبہ ہے ان لوگوں کا جو قرآن کے پڑھنے پڑھانے والے ہیں' سمجھنے سمجھانے والے ہیں' قرآن کی مہارت رکھتے ہیں' پڑھتے ہیں تو صحیح پڑھتے ہیں' اس کے مفہوم کو سمجھتے ہیں' اور اسی میں شب و روز لگے ہوئے ہیں۔

اب میں اپنے موضوع کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں جس کا تعلق ہمارے

موجودہ حالات سے ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث' جس کے الفاظ اگرچہ بہت مختصر ہیں' لیکن یہ ایک بڑی عظیم حقیقت کو بیان کر رہی ہے' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں وارد ہوئی ہے۔ اس کی رُو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ

کہ اللہ تعالیٰ اسی کتاب کی بدولت قوموں کو اٹھائے گا' ترقی دے گا' عروج بخشے گا' انہیں اس دنیا میں بلندی سے سرفراز فرمائے گا' اور اسی کتاب کو چھوڑنے کے باعث قوموں کو ذلیل و خوار کرے گا۔ یہ حدیث بڑی اہم ہے۔ میں نے جب اس حدیث پر غور کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ اس حقیقت کا تعلق بالخصوص مسلمانوں سے ہے۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بموجب مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا مستقل ضابطہ یہ ہے کہ ان میں سے جو قوم بھی قرآن کو لے کر اٹھے گی اسے اللہ تعالیٰ دنیا میں عروج اور سربلندی عطا فرمائے گا' غلبہ عطا فرمائے گا۔ اور مسلمانوں میں سے جو قوم قرآن کو ترک کر دے گی' قرآن کو چھوڑ دے گی' قرآن کی طرف پیٹھ کر لے گی' اس کو اللہ تعالیٰ ذلیل و رُسوا کر دے گا۔ ہمارے موجودہ حالات میں یہ بات ہمارے لئے بڑی قابل توجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رواں صدی یعنی بیسویں صدی عیسوی ---- یہ دنیا میں ہماری ذلت و رسوائی کی آخری حد ہے۔ ویسے تو چند سال قبل مجھے یہ گمان ہوا تھا کہ شاید ہماری ذلت و رسوائی کا دور اب ختم ہو رہا ہے اور شاید اب ہم دنیا میں عروج کی طرف گامزن ہو رہے ہیں۔ وہ جو مولانا حالیؔ نے کہا تھا کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

تو یہ قانونِ فطرت ہے۔ جزر کے بعد مدّ آتا ہے اور مدّ کے بعد جزر۔ تو ایک خیال یہ آیا تھا کہ شاید ہمارے زوال کا دور اب ختم ہو گیا ہے اور ہمارے عروج کا دور شروع ہو گیا ہے۔ یہ دن وہ تھے جب ہمارے یہاں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی تھی۔ ملتِ اسلامیہ میں

بہت جوش اور ولولہ نظر آ رہا تھا۔ اس زمانے میں شاہ فیصل موجود تھے' جو مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے تھے۔ عرب حکمرانوں کے اندر بھی اتحاد نظر آ رہا تھا اور عربوں نے اقبالؒ کے الفاظ میں ع "لڑا دے ممولے کو شہباز سے!" کے مصداق تیل کا ہتھیار استعمال کر کے امریکہ جیسی طاقت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پھر یہ کہ ترکوں اور عربوں کے درمیان جو دشمنی تھی' وہ بھی کچھ کم ہو رہی تھی۔ چنانچہ بہت سے اعتبارات سے محسوس ہوتا تھا کہ اب شاید امتِ مسلمہ کے دن پھرنے والے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ غالباً ابھی ہمارے اوپر اللہ کے عذاب کے مزید کوڑے برسنے والے ہیں۔ اب تک ہماری پیٹھ پر عذابِ الٰہی کے کئی کوڑے برس چکے ہیں۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ان سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ ۱۹۱۹ء کا بالشویک انقلاب کوئی معمولی المیہ نہ تھا' جس کے نتیجے میں روسی ترکستان کا وسیع و عریض علاقہ' تاجکستان' ازبکستان اور سمرقند و بخارا جیسے ہماری تہذیب و تمدن کے ایسے بڑے گہوارے سرخ امپریلزم کے شکنجے میں آ گئے۔ اور وہاں کے مسلمانوں کی اس طرح برین واشنگ کی گئی ہے کہ انہیں اپنا مسلمان ہونا بھی یاد نہیں رہا۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے کبھی اپنے عروج و زوال کے ادوار کی طرف نظر تک نہیں کی۔ ہم تو اپنے ماضی سے بالکل منقطع ہو کر رہ گئے ہیں۔ انگریز کے مسلط کردہ نظامِ تعلیم نے ہمیں اپنے ماضی سے بالکل کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ عربی اور فارسی سے تعلق منقطع ہوا تو اپنے ماضی سے تعلق منقطع ہو گیا ہے۔ کس کو یہ معلوم ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب بنو امیہ کی فوجیں پورے سپین کو اپنے قدموں تلے روندتی ہوئی عین فرانس کے قلب میں پہنچ گئی تھیں۔ اور ایک وقت وہ بھی آیا تھا کہ ترک افواج پورا مشرقی یورپ فتح کرنے کے بعد اٹلی کے دروازوں پر پہنچی ہوئی تھیں۔

؎ کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے!
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

لیکن آج ہم ذلت و رسوائی کی چکّی میں پس رہے ہیں۔ ہر طرف سے ہمیں خطرات و خدشات نے گھیرا ہوا ہے۔ سب سے بڑا خطرہ ہمیں اپنے ہندو ہمسائے سے ہے جو قیامِ پاکستان کے وقت سے ہماری دشمنی پر کمربستہ ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ پر اندرا گاندھی نے کہا تھا

کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے بھی ان کے سینے میں انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ ان کے سینے کا اصل ناسُور تو سندھ ہے' جسے "بابُ الاسلام" بننے کا شرف حاصل ہوا۔ یہیں پر ہندو کو مسلمان کے ہاتھوں سب سے پہلی شکست اٹھانا پڑی۔ راجہ داہر یہاں پر بہت بڑے علاقے پر حکمران تھا جسے انتہائی ذلت آمیز شکست ہوئی تھی۔ اور سندھ صرف دارالاسلام ہی نہیں' اس پورے برعظیم کے لئے باب الاسلام بنا تھا۔ بے چارے مشرقی پاکستان میں تو بہت دیر بعد کہیں اسلام پہنچا تھا۔ چنانچہ سندھ سے بدلہ لینے کی امنگیں تو ان کے دل میں اب بھی ہیں۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے پر اندرا گاندھی نے اپنی قوم کو چند ماہ کے اندر ایک اور خوشخبری سنانے کا اعلان بھی کیا تھا۔ اور آپ کو یاد ہوگا کہ اسی زمانے میں یہاں لسانی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ان کی طرف سے نقشہ تیار تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے بچا لیا۔ اس وقت پورے عالمِ اسلام کے جو حالات ہیں' ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذلت و رسوائی کے یہ سائے ابھی اور گہرے ہوتے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے کوڑے جو ہماری پیٹھ پر برسے ہیں' وہ ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار نہیں کر سکے۔ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا' جیسی کچھ عربوں کو یہودیوں کے ہاتھوں شکست و ہزیمت ہوئی اور مسجد اقصیٰ ہمارے ہاتھ سے نکلی ——— اس کا تو آج ہمارے بہت سے لوگوں کے ذہن میں خیال بھی نہیں رہا ہوگا۔ جب شروع شروع میں یہ واقعہ ہوا تھا تو بڑی بے چینی تھی۔ بڑے جلسے جلوس تھے' قراردادیں پاس کی جاتی تھیں' عالمی رائے عامہ بیدار کرنے کی کوششیں ہوتی تھیں' لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہم قبلۂ اوّل پر یہودیوں کا قبضہ ذہنی طور پر تسلیم کر چکے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اب کیا صورت ہے جو سامنے آنے والی ہے۔ اگر حالات پر غور کیا جائے تو بڑا ہی تاریک اور بہت ہی مایوس کُن نقشہ سامنے آتا ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ ہماری اس ذلت و رسوائی اور پستی و زوال کا سبب کیا ہے؟

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

اس کا کوئی جواب ملنا چاہئے۔ اس کا جواب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں موجود ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کیا: "اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ"۔ ہمیں سزاوار ہے تو اسی بات کی کہ ہم نے اس قرآن کریم سے بہت دُوری اختیار کرلی۔ حضورؐ کے فرمان کے بعد کسی اور کی دلیل ضروری نہیں۔ ہمارے لئے سب سے بڑی سند اللہ کا کلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے' لیکن مزید وضاحت کے لئے اس صدی کی دو عظیم ترین شخصیتوں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں اہلِ علم کے دو حلقے ہیں۔ ایک حلقہ علماء کا ہے جن کی پوری زندگیاں دارالعلوموں میں قَالَ اللّٰہُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ کے سیکھنے سکھانے میں گزرتی ہیں۔ دوسرے ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے لوگ ہیں۔ برِّعظیم پاک و ہند میں دارالعلوموں کا سلسلہ دیوبند سے اور کالجوں یونیورسٹیوں کا سلسلہ علی گڑھ سے شروع ہوا ہے۔

اب آپ ذہن میں رکھئے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے لوگوں میں سے چوٹی کی شخصیت علامہ اقبال کی ہے۔ ذہنی و فکری اعتبار سے پورے عالمِ اسلام میں ان کی ٹکر کا آدمی اس صدی میں پیدا نہیں ہوا۔ Intellectual Level پر وہ بالکل مسلّمہ طور پر بلند ترین شخصیت ہیں جو اس صدی میں پیدا ہوئی۔ اور دینی حلقوں سے' دارالعلوموں سے تعلیم یافتہ' قال اللہ و قال الرسول کی فضاؤں میں پلنے بڑھنے والوں میں اس صدی کی عظیم ترین شخصیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تھے۔ آپؒ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم ہیں۔ اور پھر ایسے ایسے بڑے شاگردوں کے استاد ہیں کہ جن کا نام سن کر انسان کی گردن خود بخود جھک جاتی ہے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ' مولانا شبیر احمد عثمانیؒ' مولانا اشرف علی تھانویؒ' مولانا انور شاہ کاشمیریؒ' اور یہ سب کے سب شاگرد ہیں مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے۔ لفظ دیوبندی سے ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کو تھوڑا سا مغالطہ ہو جائے۔ تو میں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ مولاناؒ اس وقت جمعیت علمائے ہند کے صدر تھے جبکہ پورے ہندوستان میں ایک ہی جمعیتہ العلماء تھی۔ اُس وقت آج کی طرح دیوبندیوں' بریلویوں اور اہلِ حدیث کی علیحدہ علیحدہ یہ جمعیتیں نہ تھیں۔ جمعیتہ علمائے ہند پورے ہندوستان کے علماء کا متفقہ پلیٹ فارم تھی۔ بریلوی' دیوبندی اور اہل حدیث علماء

سب اسی میں شامل تھے۔ بالفاظ دیگر دہلی' بدایوں اور اجمیر کے علماء اسی جمعیت میں تھے۔ اور اس وقت شیخ الہندؒ اس جمعیتہ علمائے ہند کے صدر تھے۔ پھر سیاسی اعتبار سے ان کے قد کاٹھ کا تصور اس سے کیجئے کہ انہوں نے ریشمی رومال کی تحریک چلائی تھی۔ شاید آپ میں سے بہت سوں نے اس تحریک کا نام بھی نہ سنا ہو۔ اُس وقت انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے جو ایک زبردست ٹیم بنی تھی' اس کے بنانے والے یہی شیخ الہندؒ تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے انہیں گرفتار کرلیا۔ آپ اس وقت حجازِ مقدس میں تھے۔ اور شریف حسین جو والیٔ مکہ تھا' اس نے غداری کرکے گرفتار کروا دیا۔ مکّہ سے آپ کو گرفتار کرنے کے بعد انہیں ہندوستان نہیں لایا گیا' بلکہ بحیرۂ روم کے جزیرہ مالٹا میں رکھا گیا۔ گویا ۔

اقبالؒ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سَرا کو چمن سے نکال دو!

اور انہیں اس وقت رہا کیا گیا جب ٹی بی تیسری سٹیج کو پہنچ چکی تھی۔ انگریز کو اندیشہ یہ تھا کہ اگر ہماری قید میں ان کی موت واقع ہوگئی تو طوفان کھڑا ہو جائے گا' لہٰذا رہا کر دیا گیا۔ رہا ہو کر جب ہندوستان پہنچے اور بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا تو پہلے دن جو لوگ ملنے کے لئے حاضر ہوئے ان میں مہاتما گاندھی بھی تھا۔ وہ آپ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا تھا۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے شیخ الہندؒ کی شخصیت کا۔

شیخ الہندؒ اور علامہ اقبال کا ذکر میں یہاں اس لئے کر رہا ہوں کہ یہ دونوں شخصیتیں اس بات پر متّفق ہیں کہ ہمیں جو سزا مل رہی ہے' وہ قرآن کو ترک کرنے کی وجہ سے ہے۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث آپ کو سنا چکا ہوں اور ہمارے لئے مستند ترین بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہی ہے' لیکن مزید وضاحت کے لئے اپنے ان بزرگوں کی بات بھی سن لیجئے۔ علامہ اقبال نے جواب شکوہ میں فرمایا کہ ۔

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

یہی بات انہوں نے فارسی میں بڑے پر شکوہ انداز میں کہی ہے کہ ۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شُدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شُدی

اے چو شبنم برزمین افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

کہ اے امتِ مسلمہ تو جو ذلیل و رُسوا ہوئی ہے اور دنیا میں اس طرح پامال کی جا رہی ہے' یہ قرآن کو ترک کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہاں اقبال نے "مہجوریٔ قرآن" کی ترکیب سورۃ الفرقان سے لی ہے' جہاں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا○

"اور رسولؐ فریاد کریں گے کہ اے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا"۔

تو یہ ہے علامہ اقبال کی نظر میں ہماری ذلت و نکبت اور پستی و رُسوائی کا اصل سبب جو اِس نے قرآن پر گہرے غور و خوض کے نتیجے میں اخذ کیا ہے۔

دوسری طرف شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کا واقعہ اپنی کتاب "وحدتِ امت" میں نقل کر دیا' ورنہ اتنا بڑا اور اہم واقعہ ہمارے علم میں نہ آ سکتا۔ وہ اس واقعے کے عینی شاہد ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ جب مالٹا کی جیل سے رہائی پا کر ہندوستان تشریف لائے تو دارالعلوم دیوبند میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس جلسہ میں وہ سب بزرگ موجود تھے' جن کے ابھی میں نے نام گنوائے ہیں۔ یعنی مولانا حسین احمد مدنیؒ' مولانا اشرف علی تھانویؒ' مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا انور شاہ کاشمیریؒ وغیرہم۔ انہی کے ساتھ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ "ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں"۔ یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے ۸۰ سال علماء کو درس دینے کے بعد آخری عمر میں جو سبق سیکھے ہیں' وہ کیا ہیں۔ فرمایا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام

میں صَرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے ..... اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے!"

(وحدتِ امت' ص ۳۹ - ۴۰)

اس کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بڑی پیاری بات فرمائی ہے کہ حضرتؒ نے جو دو باتیں فرمائیں اصل میں وہ دو نہیں ایک ہی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے اختلافات میں شدت اس وجہ سے ہوئی کہ ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ قرآن مرکز تھا' اور جب تک سب مرکز سے جُڑے ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے بھی جُڑے ہوتے تھے۔ جب اس مرکز سے دور ہوتے چلے گئے تو ایک دوسرے سے بھی دور ہوتے چلے گئے۔ بالکل سادہ سی بات ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: "غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ تھی۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی"۔ پس اس تباہی کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے قرآن کو ترک کر دینا۔

میں آپ کو وہ حدیث سنا چکا ہوں جس میں یہ قانونِ خداوندی بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اٹھائے گا تو اسی قرآن کی وجہ سے اٹھائے گا اور جب گرائے گا تو اسی قرآن کو ترک کرنے کے باعث گرائے گا۔ آج ہم اسی قانون خداوندی کی زد میں ہیں۔ قرآن کے معاملے میں اپنا جو حال ہے وہ کسی کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے مسلمانوں کے محلوں میں سے گزرتے ہوئے ہر گھر سے قرآن پڑھنے کی آواز تو آتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ ٹھیک سے سمجھتے نہیں تھے' لیکن تلاوت تو بہرحال ہوتی تھی۔ اب تو تلاوت بھی نہیں ہے۔ غور و فکر اور سوچ و بچار کا تو سوال ہی نہیں۔ عربی کون سیکھے' کون پڑھے؟ عربی سے ہمارا کوئی دنیوی مفاد وابستہ ہو تو ہم سیکھیں۔ ہم انگریزی پڑھیں گے اور ایسی پڑھیں گے کہ انگریزوں کو پڑھا دیں' لیکن عربی سیکھنے کے لئے کوئی بھی وقت نکالنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم نے کئی جگہ عربی کلاس کا اجراء کیا۔ شروع میں بڑا ذوق و شوق ہوتا ہے۔ پچاس ساٹھ افراد شریک بھی ہو جاتے ہیں لیکن چند دنوں کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سب چھٹی کر گئے۔ پابندی کے ساتھ وقت نکالنا آسان نہیں جب تک کہ دین کی لگن نہ ہو' اور ایک فیصلہ نہ ہو کہ یہ کام مجھے کرنا ہے۔ اور اس طرح کے فیصلے ہم دنیا کے لئے تو کرتے ہیں' دین کے لئے نہیں۔

اس وقت ہمارے جو حالات ہیں' ان میں جگانے کی ضرورت ہے' ہوش میں آنے کی ضرورت ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں کہ وہ ہونا چاہئے' یہ کرنا چاہئے' اس طرح کا ہونا چاہئے۔ میں ان میں سے کسی کی تردید یا تضحیک نہیں کر رہا ہوں۔ ٹھیک ہے' اسلحہ بھی فراہم کرنا ہوگا۔ اس کے لئے حکم ربانی ہے: "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ" کہ جس قدر ممکن ہو جمع کیا جائے۔ پھر ہمیں اپنی خارجہ پالیسی پر بھی نظر کرنا ہوگی۔ دوست و دشمن کی تمیز کرنا ہوگی۔ یہ سارے کام کرنے ہوں گے۔ دعا کریں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت ملک کی زمامِ کار ہے' اللہ تعالیٰ انہیں صحیح رائے پر پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ان میں سے کسی کی نفی نہیں ہے لیکن میں جو بات بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں مسلمان کا معاملہ خاص ہے۔ ع "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی!" اس کا معاملہ عام دنیا والوں کی طرح کا نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے بایں الفاظ خطاب فرمایا گیا: "لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ" کہ تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو تم اگر نیکی کرو گی تو اس کا دُگنا اجر ملے گا اور اگر کوئی غلط حرکت کرو گی تو سزا بھی دُگنی ملے گی۔ کیونکہ تمہاری نیکی امت کی لاکھوں عورتوں کے لئے نمونہ بننے والی ہے' اور تمہاری لغزش امت مسلمہ کی کروڑوں عورتوں کے لئے لغزش کی بنیاد بن سکتی ہے۔ یہی معاملہ امّتِ مسلمہ کا ہے۔ ہمارے پاس تو اللہ کی کتاب ہے اور اس کو دنیا تک پہنچانا ہمارے ذمے لگایا گیا ہے۔ اگر ہم ہی اس میں کوتاہی کرتے ہیں تو دوسروں کے پاس تو عذر موجود ہے کہ اے اللہ' ہمیں تو انہوں نے یہ کتاب پہنچائی ہی نہیں۔ یہ بدبخت اس کے اوپر خزانے کا سانپ بن کر بیٹھے رہے' نہ خود پڑھا نہ ہمیں پڑھنے دیا' نہ خود عمل کیا' نہ اسے ہمارے سامنے رکھا۔ لہٰذا یہ دوہرے مجرم ہیں' ان کو سزا بھی دُگنی ملنی چاہئے۔ چنانچہ یہ وہ سزا ہے جو ہمیں دنیا میں مل رہی ہے اور یہی ہے اس سوال کا جواب کہ ؎

"ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!"

ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ غیر مسلم اقوام دنیا میں سربلند کیوں ہیں؟ ہم کتنے ہی گئے گزرے سہی' پھر بھی ہم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے' کوئی روزہ رکھتا ہے' کوئی نہ کوئی قرآن بھی پڑھتا ہے' لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

والا معاملہ کیوں ہے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ یہ دوہری سزا کے مستحق ہیں۔ اگر یہ اپنا فرضِ منصبی انجام دیں اور جس پیغام کے یہ علمبردار اور امین بنائے گئے تھے' اس پیغام کو دنیا میں پیش کریں اور پھیلائیں تو دوہرا اجر ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ: "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" اور اگر یہ اس میں کوتاہی کریں گے تو اولین سزا کے مستحق بھی یہی ہوں گے۔ ان کی پیٹھ پر اللہ کے عذاب کے کوڑے دوسروں سے زیادہ برسیں گے۔ اور آج ہم اسی قانونِ خداوندی کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں۔

اب میں آپ کے سامنے اس سلسلے کی ایک اور حدیث کا مفہوم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس حدیث کے راوی حضرت علیؓ ہیں۔ میں نے آپ کو ایک روایت حضرت عثمانؓ کی اور ایک روایت حضرت عمر فاروقؓ کی سنائی ہے اور اب حضرت علیؓ کی روایت بیان کر رہا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا' جس میں آپؐ نے فرمایا: عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ ظاہر ہوگا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: حضورؐ اس فتنے سے نکلنے کا راستہ کیا ہوگا' اس سے بچاؤ کیسے ہوگا' اس فتنے سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کا طریقہ کونسا ہے؟ اب اس سوال کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا: "کتاب اللہ"۔ یعنی اس فتنے سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے' اور وہ ہے اللہ کی کتاب! یہی اس فتنے سے محفوظ کر سکتی ہے۔ آپؐ نے مزید فرمایا: "فِيْهِ خَبَرُ مَا قَبْلَكُمْ وَنَبَأُ مَا بَعْدَكُمْ" کہ اس میں جو تم سے پہلے کے حالات ہیں وہ بھی لکھے ہوئے ہیں اور جو بعد میں آنے والے حالات ہیں ان کا عکس بھی اس کتاب کی آیاتِ بیّنات میں موجود ہے .....

..... یہ حدیث خاصی طویل ہے' لیکن اس کا ایک ٹکڑا میں خاص طور پر یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا: "هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ" کہ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے!!

موجودہ حالات میں ہر چہار طرف سے مسلمانوں سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ انہیں متحد ہو جانا چاہئے۔ اور انہیں اپنے سارے اختلافات ختم کر لینے چاہئیں۔ یہ بات اصولی طور پر تو درست ہے' لیکن اتحاد کی بات کرنے والے یہ نہیں بتاتے کہ بنائے اتحاد کیا ہو؟ وہ

کونسی چیز ہے جس کی بنیاد پر ہم مجتمع ہو سکتے ہیں؟ صرف خطرے کی بنیاد پر جو اتحاد ہوتا ہے وہ منفی اتحاد ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ منفی اتحاد بہت ہوئے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ آج تک ان منفی اتحادوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ تو ضرورت مثبت اتحاد کی ہے جس کے لئے کوئی ٹھوس بنیاد ہو۔ اور قرآن حکیم نے اہلِ ایمان کے لئے اتحاد کی بنیاد یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: "**وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا**" (اللہ کی رسی کو مجتمع ہو کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو!) اب غور طلب بات یہ ہے کہ وہ "حبل اللہ" کونسی ہے جسے مضبوطی سے تھاما جائے؟ زیرِ نظر حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسی کی وضاحت ہے: "**هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ**" کہ یہ قرآن مجید ہی اللہ کی وہ مضبوط رسی ہے جسے تم نے تھامنا ہے۔ یہی وہ مرکز ہے کہ اس کے قریب تر آؤ گے تو ایک دوسرے سے بھی جڑتے چلے جاؤ گے۔ اور اس سے دور ہٹتے جاؤ گے تو تمہارے اندر اضطراب' اختلاف اور انتشار اور تشتت بڑھتا چلا جائے گا

تو واقعہ یہ ہے کہ ان حالات میں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن حکیم کی طرف ہمارا رجوع ہو۔ ہماری تقدیر اس وقت تک نہیں بدلے گی جب تک اس قرآن کے ساتھ ہم اپنے تعلق کو از سرِ نو مضبوط نہیں کر لیتے۔ جب تک ہم اس قرآن کا حق ادا نہیں کریں گے' اس وقت تک صرف سازو سامان ہمارے لئے مفید نہیں ہوگا۔ سازو سامان دوسروں کے حق میں مفید ہو سکتا ہے' لیکن اس امت کے لئے یہ اس وقت مفید ہوگا جب یہ اپنے مرکز کے ساتھ بھی وابستہ ہو جائے۔ اور ہمارا مرکز' جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں قرآن ہے۔ ہمارے اتحاد کی اگر کوئی بنیاد ہے تو قرآن ہے۔ ہمارے عروج و بلندی کے لئے اگر کوئی زینہ ہے تو قرآن ہے۔ اور ذلت و رسوائی سے نجات کا کوئی راستہ ہے تو قرآن ہے۔ ہماری قسمت اسی کتاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر کوئی راستہ کھلے گا تو اسی کے ذریعے سے کھلے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اس کتاب کو حرزِ جان بنانے کی **توفیق عطا** فرمائے اور اس کے جو جملہ حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں' ان کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے۔

اقول قولی هذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

حکمتِ اقبال (۵۱)

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم

خودی اور سوشلزم (۳)

اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے

پھر نبوت انسان کو بتاتی ہے کہ جسم جس کی پرورش اور خاطر مدارات میں تم اپنی زندگی کے قیمتی اوقات غیر ضروری طور پر صرف کرتے رہتے ہو ناپائیدار اور فانی ہے اور اُس کے برعکس خودی کی زندگی پائیدار اور دائمی ہے۔ لہٰذا عقل مندی نہیں کہ ناپائیدار زندگی کی خاطر پائیدار زندگی کو قربان کر دو۔ تم جسم کی زندگی (حیاتِ دنیا) کو خودی کی زندگی (آخرت) پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ خودی کی زندگی اپنی لازوال مسرتوں کی وجہ سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ (الاعلیٰ: ۱۶، ۱۷)

پھر نبوت جسم کی زندگی یا اس دنیا کی زندگی کا تجزیہ کر کے بتاتی ہے کہ وہ ہے کیا۔ اگر اس میں خودی کی ضرورتوں کا پورا پورا اہتمام نہ کیا جائے تو اس میں انسان کے مشاغل بس یہی رہ جاتے ہیں کہ کسی کھیل اور تماشا میں لگ جانا' اپنی غذا کو' اپنے لباس کو' اپنے مکان کو اور زندگی کے دوسرے ساز و سامان کو زیادہ سے زیادہ حسین بنانے کی کوشش کرنا، ایک دوسرے کے بالمقابل فخر کرنا اور یہ ظاہر کرنا کہ میں دوسروں سے بہتر ہوں' زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے کی کوشش کرتے رہنا اور اولاد کو زیادہ خوشحال بنانے کی جدوجہد کرنا۔ ان تمام مشاغل کی مثال ایسی ہے جیسے کہ آسمان سے مینہ برسے اور اس سے کھیتی لہلہانے لگے' پھر پورے جوبن پر آئے اور پک کر زرد ہو جائے اور کسان اس کو دیکھ کر خوش ہو جائے لیکن آخرکار یہی کھیتی چورا چورا ہو جائے۔ اسی طرح سے اگر دنیا کمانے والا اپنی تمام خواہشات کے مطابق سب کچھ

حاصل کرلے تو پھر بھی موت اس کی کامیابی کو کالعدم کر دیتی ہے اور اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا' بلکہ اُسے آخرت میں خودی کی ضروریات کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے سخت عذاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان مشاغل کو ضرورت اور کفایت کے دائرہ کے اندر محدود کر دے اور اُن کی بجائے خودی کی زندگی یا آخرت کی زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل کرے تو اُسے خدا کی بخشش اور رضامندی حاصل ہوتی ہے معلوم ہوا کہ جسم کی زندگی دھوکے کا مال ہے جو دیکھنے میں تو اچھا ہے لیکن دراصل خراب اور نکما ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (الحدید: ۲۰)

نبوت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ زندگی اگر کوئی ہے تو وہ فقط خودی کی زندگی ہے جسم کی زندگی اس قدر مختصر اور بے ثبات ہے کہ اسے زندگی سمجھنا ہی غلطی ہے۔ انسان اگر سو سال تک بھی زندہ رہے تو موت کے وقت اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی زندگی کی مدّت ایک دن یا ایک دن کے حصّہ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ قرآن حکیم میں ایک شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے جسے خدا نے ایک سو سال تک حالتِ موت میں رکھا اور پھر زندہ کیا۔ اور جب اُسے پوچھا گیا کہ تم کتنا عرصہ پڑے رہے ہو تو اُس نے جواب دیا ایک دن یا دن کا ایک حصّہ۔ فرمایا گیا کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے!

اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۶۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو یعنی دنیا یا جسم کی زندگی کو آخرت یا خودی کی زندگی کے لیے رکاوٹ نہ بناؤ بلکہ معاون بناؤ۔ جن لوگوں کے اعمال سب سے زیادہ لغو اور بیکار اور نقصان رساں ہیں وہ وہی ہیں جن کی ساری کوششیں جسم کی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں ضائع ہو گئیں اور اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ نہایت ہی اچھا کام کر رہے ہیں:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ (الکہف: ۱۰۳-۱۰۴)

مومن اپنی جان اور اپنا مال خدا کو دے چکا ہے

پھر نبوت نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم جنّت چاہتے ہو تو خدا پر ایمان لاؤ یعنی جو بات خدا نبوت کی معرفت تمہاری بھلائی کے لیے کہتا ہے اُسے برحق جانو۔ اور خدا پر ایمان لانے کی شرط یہ ہے کہ اپنی جان اور اپنا مال دونوں کو خدا کے حوالے کر دو کہ وہ جب چاہے اور جس طرح سے چاہے ان کو خرچ کرے اور تم خود اس بات کی ہرگز کوئی فکر نہ کرو کہ ان دونوں میں سے کوئی چیز تمہارے پاس باقی رہتی ہے یا نہیں۔ ان کے عوض میں تمہیں جنت حاصل ہوگی جو خودی کی کامیاب زندگی کا نتیجہ ہوتی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ:۱۱۱)

افلاس کے خوف سے بچنے کی ضرورت

پھر نبوت انسان کو بھوک اور افلاس کے خوف سے نجات دلانے کی کوشش کرتی ہے تاکہ انسان اُن کے خوف سے خودی کو چھوڑ کر جسم کے مطالبات کی پیروی میں نہ لگ جائے۔ وہ اُسے کہتی ہے کہ تمہیں حد سے زیادہ روٹی کی فکر نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ خدا نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمّے لے رکھا ہے اور وہ اُسے ضرور مل کر رہے گا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود:۶) خدا رازق ہے اور رازق بھی ایسا جو کمزور نہیں ہے کہ کبھی رزق پہنچا سکے اور کبھی نہ پہنچا سکے بلکہ وہ رزق بہم پہنچانے کی زبردست قوت کا مالک ہے: هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (الذاریات:۵۸) جسمانی ضرورتوں کا حیاتیاتی دباؤ اور اُن سے پیدا ہونے والا طلبِ معاش کا جذبہ جو خدا نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے ان ذرائع میں سے ایک ہے جو خدا انسان کو رزق بہم پہنچانے کے لیے کام میں لاتا ہے۔ لہٰذا معاش کی جستجو کرنا بھی ایک فرض قرار دیا گیا ہے لیکن معاش کی جستجو مقصود بالذّات نہیں بلکہ اسے خدا کی عبادت اور اطاعت کے لیے جسم کو زندہ رکھنے کا ایک ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ مقصود بالذّات کے طور پر معاش کی جستجو انسان کو کسبِ معاش کے غلط طریقوں کو اختیار کرنے اور خودی کی ضرورتوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور کرتی ہے اور خودی کی ان ضرورتوں میں سے ایک توکل بھی ہے۔

پھر نبوت انسان کو براہِ راست بھی اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ مفلسی کے خوف سے بے پروا

ہو کر اپنی خودی کی ضرورتوں کو پورا کرو اور یقین رکھو کہ خدا اس بات پر قادر ہے کہ چاہے تو تمہیں دولت مند بنا دے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ (التوبہ: ۲۸)

مفلسی ایک امتحان ہے

مفلسی اس لیے آتی ہے کہ انسان کو آزمایا جائے کہ آیا وہ مفلسی کی حالت میں صبر سے کام لے کر حق کے راستہ پر ثابت قدم رہتا ہے یا مفلسی کے خوف سے اس راستہ کو چھوڑ کر اپنی مفلسی کو ہر جائز یا ناجائز طریق سے دور کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ حضور نے فرمایا ہے کہ افلاس انسان کو کفر کے قریب لے آتا ہے (كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا) یہی سبب ہے کہ خدا افلاس کو ایمان کی آزمائش کے لیے کام میں لاتا ہے۔ سچا اور پکا ایمان وہی ہے جو افلاس کی حالت میں بھی متزلزل نہ ہو اور جس کے ہوتے ہوئے افلاس صبر کا ردعمل پیدا کرے اور کفر اور معصیت کا ردعمل پیدا نہ کر سکے۔ جو مومن آزمائش میں صبر سے کام لیتا ہے اور خودی کی ضروریات کی تشفی کرنے میں پریشان ہونے کے بغیر مصروف رہتا ہے اس کی خودی اپنی ترقی کے ایک بلند تر مقام پر قدم رکھتی ہے' جس طرح سے ایک طالب علم جو امتحان میں کامیاب ہوتا ہے ترقی پا کر اوپر کی جماعت میں پہنچ جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ ہم ضرور ہی تم کو موت کے خوف سے' بھوک سے' مالوں اور جانوں کے نقصان سے اور زرعی پیداوار کی کمی سے آزمائیں گے اور جو لوگ ان مصیبتوں پر صبر کریں گے اُن کو خوش خبری سنا دیں کہ اس امتحان میں کامیاب ہونے کی وجہ سے اُن کی خودی کے درجاتِ ارتقا بلند ہوں گے (نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ۔ الانعام: ۸۳) جن بدبخت لوگوں پر افلاس کا خوف یہاں تک سوار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیتے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ اُن کے لیے رزق بہم پہنچانا مشکل ہو جائے نبوت اُن کو اس حرکت سے باز رہنے کا حکم دیتی ہے اور اُن کے خوف کو دور کرنے کے لیے اُن کو یقین دلاتی ہے کہ اُن کا اور اُن کی اولاد کا رازق خدا ہے اور وہ خود نہیں۔ خدا کا ارشاد ہے کہ اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو' تمہیں اور تمہاری اولاد دونوں کو رزق دینے والے ہم ہیں۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (بنی اسرائیل: ۳۱)

کفایت شعاری کی تلقین

پھر خودی کے ٹٹو یعنی جسم کے حد سے متجاوز مطالبات سے خودی کو بچانے کے لیے نبوت اس بات پر زور دیتی ہے کہ جسم کی ضرورتوں پر بقدرِ کفایت خرچ کرو جس سے جسم زندہ اور توانا رہے اور خودی کے کام آتا رہے۔ جو لوگ اس سے زیادہ خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں کیونکہ وہ شیطان کے مقصد کو پورا کرتے ہیں جو یہ چاہتا ہے کہ انسان خودی کی ضرورتوں کو نظر انداز کرے اور جسم یا نفس کی ضرورتوں کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دے یہاں تک کہ اس کی زندگی ختم ہو جائے اور وہ جہنم میں پہنچ جائے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (بنی اسرائیل: ۲۷)

فالتو مال کو صدقہ میں دینے کا حکم

اور پھر نبوت یہ حکم دیتی ہے کہ کفایت اور ضرورت سے جو کچھ بچ رہے وہ اپنے پاس نہ رکھو بلکہ خدا کی راہ میں دے دو۔ (وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ البقرہ: ۲۱۹) نبوت کی تعلیم کا زور اس بات پر ہے کہ مال کو جسم کی وقتی ضرورت کا مداوا سمجھا جائے اور اسے جمع نہ کیا جائے۔ جو لوگ سونا اور چاندی کے سکوں کی صورت میں یا کسی اور صورت میں سونا اور چاندی کے سکوں کی شکل اختیار کر سکتی ہے مال جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں نہیں دیتے انہیں دردناک عذاب ہوگا۔ جب سونے اور چاندی کے سکے دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیے جائیں گے اور پھر اُن سے اُن کی پیشانیاں اور اطراف اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ سو جو کچھ تم جمع کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ۝ (التوبہ: ۳۴، ۳۵)

حضورؐ کی وفات کے بعد حضور کے مقدس صحابی جناب ابوذر غفاریؓ جب دیکھتے تھے کہ لوگ خدا کے

اس حکم پر عمل نہیں کرتے جو اس آیت کے اندر موجود ہے اور مال جمع رکھتے ہیں تو اُن کو دکھ ہوتا تھا اور وہ لوگوں کو خدا کی اس نافرمانی کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔

حبِّ غیر اللہ کا استیصال

مومن کا صدقہ صرف اسی صورت میں سچی شمار ہوتا ہے جب وہ اس کی ملکیت کی اُن چیزوں پر مشتمل ہو جن سے اس کو محبت ہے کیونکہ اُسی صورت میں وہ غیر اللہ کی محبت کا استیصال کرتا ہے اور خدا کی محبت کو آزمائش میں کامیاب کر کے پختہ کرتا ہے۔ چنانچہ خدا کا ارشاد ہے کہ جب تک تم اپنی ایسی چیزیں خیرات میں نہ دے دو جن سے تمہیں محبت ہے تم ہرگز نیکی نہ پا سکو گے (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ - آلِ عمران: ۹۲) جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت طلحہؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ میرے پاس ایک باغ ہے جس سے مجھے بڑی محبت ہے' میں خدا کے اس حکم کی تعمیل میں اُسے خیرات میں دینا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔ اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صدقہ کا پہلا اور اصل مقصد صدقہ دینے والے کی خودی اور اس کی محبت کی تربیت اور ترقی ہے، نہ کہ افلاس کا ازالہ۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ صدقہ دینے سے افلاس کا ازالہ بھی ہوتا ہے لیکن صدقہ کے ذریعے سے افلاس کا دُور کرنا نیکی اس لیے ہے کہ ایک تو اس سے صدقہ دینے والے کے دل سے غیر اللہ کی محبت رخصت ہوتی ہے اور اُس میں خدا کی محبت کے لیے جگہ پیدا ہوتی ہے اور دوسرے وہ خدا کے اخلاقِ ربوبیت اور رزاقیت سے متخلق ہوتا ہے جس سے اُس کی خودی تربیت اور ترقی پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بقدرِ استطاعت انفاق کا حکم مُفلس کو بھی ہے اور دولت مند کو بھی' اور ہر حالت میں ہے تنگدستی میں بھی اور فارغ البالی میں بھی۔ (اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ - آلِ عمران: ۱۳۴) حالانکہ تنگدستی کی حالت میں انسان اپنے جسم کی جائز ضرورتوں کو بھی نظر انداز کر کے ہی دوسروں کو دے سکتا ہے۔

خدا کی رضاجوئی

یہی وجہ ہے کہ خیرات اور صدقہ کی قبولیت کی شرط یہ رکھی گئی ہے کہ اُس کے پیچھے خدا کی رضا جوئی کی نیت موجود ہو' ورنہ صدقہ دینا نہ دینا برابر ہو جاتا ہے' بلکہ صدقہ دینا ریاکاری یا شرک ایسی ایک معصیت

شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ صدقہ لینے والے مفلس کی جسمانی ضرورت تو پھر بھی اس سے ویسی ہی پوری ہوتی ہے لیکن چونکہ ایسے صدقہ سے دینے والے کی خودی کی پرورش نہیں ہوتی اس فعل کو بیکار اور عبث ہی نہیں بلکہ ایک گناہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ اپنے صدقوں کو احسان جتا کر یا بعد میں ذہنی آزار پہنچا کر ضائع نہ کرو' ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم بھی اس شخص کی طرح ہو جو خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور جو خدا کی محبت اور خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ (لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ البقرہ: ۲۶۴) مومن کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ مفلس کو کھانا کھلائے لیکن اپنی نیکی کو اس توقع سے ضائع نہ کرے کہ کھانا کھانے والا کل کو اس کے کام آئے گا یا اس کا شکر گزار ہوگا بلکہ واشگاف یہ اعلان کر دے کہ وہ محض لوجہ اللہ کھانا کھلا رہا ہے اور اس کے عوض میں کوئی صلہ یا شکریہ نہیں چاہتا تاکہ خدا کی محبت کا جذبہ اس کے عمل میں اظہار پائے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اس کی خودی کے درجاتِ ارتقاء بلند ہوں۔ (اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۔ الدہر: ۹) ایمان لانے والوں کا امتیاز یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مسکینوں' یتیموں اور اسیروں کو محض خدا کی محبت کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ (وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۔ الدہر: ۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خدا کی رضامندی کے لیے محبت کرے' خدا کی رضامندی کے لیے بغض رکھے' خدا کی رضامندی کے لیے دے اور خدا کی رضامندی کے لیے دینے سے رک جائے (مثلاً جب دینا غیر اللہ کے لیے ہو) تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل کر لیا۔

تزکیہ نفس

زکوٰۃ کے متعلق حضورؐ نے فرمایا تھا کہ وہ ایک صدقہ ہے جو تمہارے دولت مندوں سے وصول کر کے تمہارے مفلسوں کو دیا جاتا ہے (صَدَقَةٌ تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِكُمْ وَتُرَدُّ اِلٰى فُقَرَاءِكُمْ) اس صدقہ کی اصلی اور بنیادی غرض بھی مومن کی خودی کی تربیت ہے۔ لفظ زکوٰۃ کا مفہوم بتا رہا ہے کہ اس کا مقصد کسی کا تزکیہ کرنا ہے' کسی کی خودی کو خدا کی صفاتِ ربوبیت و رزاقیت سے حصہ دلا کر پاک کرنا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ زکوٰۃ سے یہ تزکیہ اسی لیے ہوتا ہے کہ اس سے کسی حاجت مند کی حاجت پوری ہوتی

ہے' ورنہ زکوٰۃ ادا کرنا خدا کی صفاتِ ربوبیت اور رزاقیت سے حصّہ نہ دلا سکے اور خودی کا تزکیہ نہ کر سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا تھا کہ مسلمانوں کے مال سے صدقہ وصول کر و جو اُن کے دلوں کو پاک کرے۔ (خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا ۔ التوبہ: ۱۰۳) یہ نہیں فرمایا گیا تھا جو مفلسوں کی مفلسی کو دور کرے" اگرچہ صدقہ سے ضمناً مفلسی بھی دور ہوتی ہے۔ پھر ایسا صدقہ جو غیر اللہ کے لیے دیا جائے (مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۔ البقرہ: ۱۷۳) شرک ہے اور اس کا قبول کرنا بھی حرام ہے' حالانکہ ایسا صدقہ بھی مفلسی کو دُور کر سکتا ہے۔

خودی کی تربیت

غرض لوگوں کو کھانا کھلانا اور مال و زر بخشنا بذاتِ خود کوئی نیکی نہیں جب تک کہ اس کے عقب میں خدا کی رضامندی کو حاصل کرنے کی نیت موجود نہ ہو۔ ایسی نیت کے بغیر یہ نیکی ایک باعثِ عذاب بدی بن جاتی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ تعلیم نبوت میں غربا کی مالی امداد کے حکم کا بنیادی مقصد وہی ہے جو خدا کی عبادت کا مقصد ہے' یعنی تخلّق باخلاق اللہ سے خودی کے جذبۂ محبت کی تشفی اور پھر اس کی تشفی سے خودی کی تربیت اور ترقی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں زکوٰۃ کا حکم صلوٰۃ کے حکم کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ اور دوزخ میں جانے والے بھی اپنے ان دو جرموں کا ذکر ایک ساتھ ہی کریں گے کہ وہ نہ نماز پڑھتے تھے اور نہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

سوشلزم نیکی سے بے تعلّق ہے

حضورؐ کی تعلیم نے اس گرانقدر حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ہر عمل کی حیثیت اور قدر و قیمت کا دار و مدار اُس نیت پر ہوتا ہے جو اُس کی محرک ہوئی ہو۔ وہی عمل جو ایک نیت کے ساتھ صواب ہو دوسری نیت کے ساتھ ناصواب ہو جاتا ہے (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ) سوشلسٹوں کی اقتصادی مساوات کی کوششوں کے پیچھے خدا کی رضاطلبی کی کوئی نیت نہ موجود ہے اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ سوشلزم خدا کے انکار پر مبنی ہے' لہٰذا یہ کوششیں اصل انسان یا خودی کے کسی کام کی نہیں اور ان میں کوئی نیکی یا خوبی موجود نہیں۔ اس کے برعکس چونکہ یہ کوششیں خودی کے اصل مقصود کو انسان کی نظروں سے اوجھل کر دیتی ہیں لہٰذا وہ اس کے لیے موت کا پیغام آتی

نبوت خودی کی مشکلات کا حل پیش کرتی ہے

اُوپر کی تصریحات سے ظاہر ہے کہ نبوت سب سے پہلے اور براہِ راست جس مشکل کا حل پیش کرتی ہے وہ یہ نہیں کہ انسان کے عارضی اور ناپائدار آلۂ کار جسم کی پرورش کس طرح سے کی جائے بلکہ یہ ہے کہ انسان کی خودی کی پائدار اور مقصود بالذات زندگی کو اس کے جسم کی پرورش کے جبلّتی تقاضوں کی زیادتیوں' خودغرضیوں اور بے اعتدالیوں کی دست بُرد سے کس طرح بچایا جائے تاکہ وہ تادمِ مرگ پوری آزادی کے ساتھ خدا کی محبت کے جذبہ کی تشفی کرتی رہے اور کائنات کے ارتقاء کا عمل' جو خودی کے اس عمل سے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچنے والا ہے' پوری قوت سے جاری رہے اور انسانی فرد کی خودی بھی بعد از مرگ خوف اور غم سے محفوظ رہے اور مسرّت اور شادمانی سے ہمکنار ہو' یعنی دوزخ سے بچے اور جنت میں جائے۔ نبوت کا مقصد اصل انسان کی خیر خواہی اور راہ نمائی ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی حقیقت خدا کی محبت کا ایک جذبہ ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ نبوت اسی جذبہ کی تشفی کی راہ نمائی کرتی ہے۔ نبوت براہِ راست افلاس کا علاج نہیں کرتی بلکہ افلاس کے خوف کا علاج کرتی ہے تاکہ اُس بے حقیقت کیمپڑ کے تقاضے جس کو جسم انسانی کہا جاتا ہے غالب آکر مستقل قدر و قیمت کے اُس گوہرِ تابدار کو برباد نہ کر دیں جسے انسانی خودی کا نام دیا گیا ہے۔

سوشلزم کے نظام میں سچی نیکی ممکن نہیں

بعض سوشلزم پسند مسلمان یہ کہا کرتے ہیں کہ سوشلزم کے نظام میں بھوک کے ختم ہونے سے بدی کی تمام قسمیں ختم ہو جاتی ہیں اور نیکی کا دَور دَورہ ہو جاتا ہے' کیونکہ بھوک ہی چوری' ڈاکہ زنی' رشوت ستانی' دروغ گوئی' دھوکہ دہی' قتل اور تشدد اور عصمت فروشی کا سبب بنتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ حضرات نیکی اور بدی اور سچی نیکی اور جھوٹی نیکی کے اُس فرق کو مدِنظر نہیں رکھتے جس کی وضاحت ہمیں قرآن حکیم میں ملتی ہے۔ قرآن حکیم نے سچے اور اصلی فعلِ جمیل کو جھوٹے اور نقلی فعلِ جمیل سے ممیز کیا ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ دنیا میں نیکی کی اتنی ہی قسمیں ہیں جتنے کہ نظریاتِ زندگی ہیں۔ ہر نظریۂ حیات کی نیکی الگ قسم کی ہوتی ہے جو اُس نظریہ سے مطابقت رکھتی ہے۔ سچی نیکی پھر کون سی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ وہی

ہوگی جو سچے نظریے سے مطابقت رکھے گی۔ قرآن حکیم کے نزدیک سچی نیکی صرف وہی ہے جو خدا کی محبّت کے سرچشمہ سے پھوٹے اور جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو۔ اصلی سخاوت اور نقلی سخاوت' اصلی سچ اور نقلی سچ' اصلی عدل اور نقلی عدل' اصلی پرہیزگاری اور نقلی پرہیزگاری' بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہیں' لیکن درحقیقت دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

سچی نیکی کی تعریف

قرآن حکیم کے نزدیک سچی نیکی وہی ہے جس کا مقصد خدا کی محبّت کے اظہار اور خدا کی خوشنودی کی طلب کے سوائے اور کچھ نہ ہو۔ ایسی نیکی خدا کی محبّت کو اور فروغ بخشتی ہے لیکن جھوٹی نیکی جس کی ہزاروں قسمیں ہوسکتی ہیں خدا کے منکر یا نافرمان کی نیکی ہے جو کسی غلط نصب العین کی محبت سے پیدا ہوتی ہے اور اُسی غلط محبّت کو اور فروغ دیتی ہے۔ چونکہ وہ خودی کے جذبۂ محبت کو غلط راستہ پر ڈالتی ہے' وہ خودی کی پرورش نہیں کرتی بلکہ اُس کی پرورش کے عمل کو نقصان پہنچاتی ہے۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں ایسی نیکی ضائع ہوجاتی ہے۔ ایسی نیکی راکھ کے اُس ڈھیر کی ہے جس پر آندھی کے دن تیز ہوا چلے اور اُسے اڑا کر لے جائے۔ اس طرح کافر جو کچھ کماتے ہیں اس میں سے اُن کے ہاتھ کچھ نہیں آتا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ (ابراہیم: ۱۸)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا کہ کافروں کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کو پیاسا اُسے پانی سمجھے' یہاں تک کہ جب اُس کے پاس آئے تو اُسے کچھ بھی نہ پائے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا ۔ (النور: ۳۹)

اُن کے اعمال ضائع ہوجاتے ہیں اور قیامت کے دن جب اعمال کا محاسبہ ہوگا تو اُن کا کوئی وزن شمار میں نہیں آئے گا۔

فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۔ (الکہف: ۱۰۵)

حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص خدا سے اپنی سخاوت کا اجر طلب کرے گا تو خدا اُسے کہے گا کہ تم نے سخاوت اس لیے نہیں کی تھی کہ میں تم پر راضی ہو جاؤں' بلکہ اس لیے کی تھی کہ لوگ تمہاری ستائش کریں اور تمہیں سخی کہیں' سو لوگوں نے تمہیں دنیا میں سخی کہہ دیا' اب یہاں تمہارے لیے کوئی اجر نہیں۔ سوشلزم کے نظام کے لیے بے خدا ہونا ضروری ہے' بلکہ وہ خدا پرستی کی مخالفت کی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اُس میں نیکی کا وجود ناممکن ہے نیکی خدا کی محبت کا ایک پہلو یا جزو ہے' جو اُس سے الگ پایا نہیں جا سکتا۔ جہاں اُس کا کل نہ ہوگا وہاں اس کا جزو بھی نہیں ہو سکتا۔ جب درخت ہی موجود نہ ہو تو اس کا کوئی پتہ یا پھل یا پھول کیسے موجود ہو سکتا ہے۔

اخلاقی برائیوں کے محرکات

پھر ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جن برائیوں کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اُن کے اسباب و محرکات بھوک اور افلاس کے علاوہ اور بھی ہیں۔ جو خوش حالی اور فارغ البالی کی حالت میں اور بھی زیادہ مؤثر اور فعّال ہو جاتے ہیں۔ مغرب میں ان جرائم کی روز افزوں ترقی کا باعث زیادہ تر بے فکری' فارغ البالی' تنوع پسندی اور تفریح طلبی ہے۔ اگر خدا کا خوف نہ ہو تو اعمال میں اخلاقی نظم اور ضبط پیدا کرنے والی کوئی اور مؤثر اندرونی قوت موجود نہیں ہوتی اور ایسی حالت میں عافیت بھی انسان کے لیے بارِ گراں بن جاتی ہے' لیکن جہاں ان جرائم کا سبب بھوک اور افلاس ہو وہاں اگر بھوک اور افلاس کے دُور ہونے سے ان کا ازالہ ہو جائے تو اصلی اور حقیقی نکوکاری ان کی جگہ نہیں لے گی' کیونکہ بھوک اور افلاس کے واپس آنے پر پھر ان کی طرف عود کرنے کی نیت موجود رہے گی اور یہ نیت ان کی نکوکاری کو خاک میں ملاتی رہے گی۔ لہٰذا اگر سوشلسٹ ملکوں میں بھوک اور افلاس کے دُور ہونے سے کوئی نیکی رواج پذیر ہوئی ہے تو وہ اصلی اور سچی نیکی نہیں۔ اصلی نیکی وہی ہے جس کا سبب دولت مندی نہ ہو بلکہ خدا کی رضامندی ہو۔ جو لوگ افلاس کی حالت میں ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کر کے اپنے افلاس کا ازالہ کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہوں سوشلزم کا نظام افلاس اور بھوک کا ازالہ کر کے ان کو نیک نہیں بنا سکتا۔

نفسانی لذّات کی افیون

سوشلسٹ کہا کرتے ہیں کہ مذہب' جو صبر و قناعت اور شکر گزاری اور امن پسندی اور تقدیر کے ساتھ رضامندی کی تلقین کرتا ہے' ایک افیون ہے' جو انسان کو اس کی اصلی ضرورتوں سے غافل کر دیتی ہے۔ مذہب پر ان کا یہ حملہ قابلِ معافی ہے' اس لیے کہ وہ بیچارے فقط ناپائیدار سٹوّا اور اس کی ضرورتوں کو جانتے ہیں اور باقی رہنے والے اور آگے جانے والے روحِ روان ارتقائے کائنات سوار کا اور اس کی ضرورتوں کا اُن کو علم ہی نہیں۔ اگر اصل انسان انسان کا جسم ہوتا اور اگر انسان کی اصل ضرورتیں اس کے جسم کی ضرورتیں ہوتیں تو سوشلسٹوں کی یہ بات درست ہو سکتی تھی' لیکن حقیقتِ حال یہ نہیں۔ اصل انسان انسان کا جسم نہیں بلکہ اُس کی خودی ہے' لہٰذا مردِ مومن کو حق پہنچتا ہے کہ وہ سوشلسٹوں کے برعکس یہ کہے کہ جسمانی خواہشات کی لذّت ایک افیون ہے جو انسان کو اُس کی اصل سے غافل کر دیتی ہے۔ لہٰذا وہ جسمانی خواہشات کو جس قدر نظر انداز کرے گا اور کم کرے گا اُسی قدر اُس کے لیے اچھا ہے' کیونکہ اسی قدر وہ اپنی اصل ضرورتوں کو پُورا کرنے کے لیے آزاد ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ مومن اپنے نفس کے ساتھ برسرِ پیکار رہتا ہے اور اُسے اُبھرنے نہیں دیتا۔

مردِ مومن زندہ و باخود بجنگ
بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

مردِ مومن کے برعکس اگر ایک سوشلسٹ نادانی سے یہ سمجھتا ہے کہ جسم ہی سب کچھ ہے اور خودی اور اُس کے تقاضے محض توہمات ہیں تو قدرتی بات ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ وہ جس قدر خدا کا خیال دل سے نکالے گا اسی قدر اُس کے لیے اچھا ہے' کیونکہ اسی قدر وہ جسم کے مطالبات کو آزادی سے پورا کر سکے گا۔ اس بے بنیاد مفروضہ کو اپنانے کے بعد اگر وہ مذہب کو ایک افیون نہ سمجھے تو اور کیا سمجھے! (جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدّس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حُرمتی سے محفوظ رکھیں۔

وراثت میں عورتوں کا حصہ

—— پروفیسر ڈاکٹر عابدہ خواجہ ——

عرب ایک ایسا علاقہ تھا جس میں کوئی باضابطہ قانون نہیں تھا' بلکہ ان کے اپنے رائج کردہ قوانین تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں جہاں اور طرح طرح کے جاہلانہ خیال اور ظالمانہ رسمیں رائج تھیں' وہاں ایک ستم ظریفی یہ تھی کہ مرنے والے کا مال صرف وہی مرد لیتے تھے جو پورے جوان اور جنگ میں جانے کے قابل ہوتے تھے۔ "عورتوں' بچوں اور ضعیفوں کو میراث نہیں ملتی تھی' مفلس اور بے کس بیوہ' معصوم یتیم' قابلِ رحم لڑکے اور لڑکیاں روتے چلاتے رہ جاتے' اور جوان قوی مالدار چچا اور بھائی آکر آنکھوں کے سامنے سب مال پر قبضہ کر لیتے تھے' ان کی آہ و بکا کا سننے والا اور ظالموں کے پنجے سے مال کو نکالنے والا کوئی نہ تھا"۔(۱)

ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے:

"There could have been no question in those days of a widow inheriting from her husband since she was regarded as a part of property which went over to the heir ..... nor could have been a question about daughters inheriting from their fathers, since daughters were given in marriage, either by their fathers or by their brothers of other relations after the father's death, thus becoming the property of the family into which they married. (2)

ارشادِ نبوی ہے:-

عن جابر بن عبد اللّٰہ قال خرجنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم حتی جئنا امرأۃً من الانصار فی الاسواف فجاء تِ المرأۃُ بابنتین لھا فقالت یا رسول اللّٰہ ھاتان بنتا ثابتِ بن قیس قُتِلَ معک یومَ الاحد وقد استفاء عمُّھما مالَھما و میراثَھما کلَّہ ولم یدَ ع مالًا الا اَخذہ فما تری یا رسول اللّٰہ فو اللّٰہ لا تُنکحانِ ابدًا اِلّا ولھما مالٌ فقال رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلّم یقضی اللّٰہُ فی ذٰلک وقال نزلت سورۃُ النساء "یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی اَولَادِکُم" الایہ' فقال رسول اللّٰہ صلّی

اللہ علیہ والہ وسلم ادعوا لِی المرأۃَ و صاحبَھا، فقال لعمّھما أعطھما الثّلثین واَعطِ امّھما الثّمنَ وما بقی فلک (ابو داؤد کتاب الفرائض و بمعناہ فی الترمذی ابواب الفرائض)(۳)

(ترجمہ)"حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلے، اسی اثناء میں ہمارا گزر اَسواف میں ایک انصاری خاتون کے پاس سے ہوا تو وہ خاتون اپنی دو بیٹیوں کو لے آئی اور عرض کیا: یارسول اللہؐ یہ دونوں (میرے شوہر) ثابت بن قیس (رضی اللہ عنہ) کی بچیاں ہیں جو جنگِ احد میں آپؐ کے ہمراہ (لڑتے ہوئے) شہید ہو گئے۔ (ان کی شہادت کے بعد) ان بچیوں کے چچا نے ان کے سارے مال اور ساری میراث پر قبضہ کر لیا اور (ان کے لئے) کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ یارسول اللہؐ اس معاملے میں آپؐ کیا فرماتے ہیں؟ خدا کی قسم اگر ان بچیوں کے پاس مال نہ ہوگا تو ان کا کبھی نکاح بھی نہیں ہو سکے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: اس معاملے میں اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائیں گے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ پھر جب سورۃ النساء کی یہ آیت **یُوْصِیکُم اللّٰہُ فِی اَوْلَادِکُم الآیہ** ("اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے" الخ) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس (مدعیہ) عورت کو اور اس کے (مدعاعلیہ) دیور کو میرے پاس بلاؤ۔ چنانچہ آپؐ نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ لڑکیوں کو کل مال کا دو تہائی حصہ دے دو اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ، اور جو بچے وہ تم خود رکھ لو"۔

اسلام نے بیوی، ماں، بیٹی اور بہن کی حیثیت تسلیم کروانے کے بعد عورت کو وراثت میں بھی حصہ دار بنایا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی اَوْلَادِکُم لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ............ وَصِیَّۃً مِّنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَلِیمٌ حَلِیمٌ ○ (النساء: ۱۱-۱۲)

(ترجمہ) "اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولادوں کے بارے میں وصیت کرتا ہے، ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہو گا۔ اگر بیٹیاں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لئے دو تہائی ہے جو (میت نے) چھوڑا۔ اگر ایک ہو تو وہ آدھے ترکے کی وارث ہو گی، اور والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اس میں سے جو (میت نے) چھوڑا اگر اس (میت) کی اولاد ہو، اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس

کے والدین اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی ہو گا۔ پھر اگر میت کا کوئی بھائی ہو تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا' لیکن یہ وصیت پر عمل کرنے اور میت کا قرض ادا کرنے کے بعد ہو گا۔ باپوں اور بیٹوں میں کون زیادہ تمہیں نفع دینے والا ہے' اس کے بارے میں تم نہیں جانتے۔ (ترکے کو وارثوں میں تقسیم کرنا) یہ اللہ کی طرف سے فرض ہے' بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اور اگر تمہاری بیویوں کی اولاد نہ ہو تو ان کی میراث میں سے تمہارے لئے نصف ہے' اگر ان کی اولاد ہو تو پھر تمہارے لیے چوتھائی حصہ ہے' وصیت پر عمل کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد اس میں سے جو انہوں نے پیچھے چھوڑا ہے۔ اور اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہاری بیویوں کے لیے تمہاری میراث میں سے چوتھائی حصہ ہے' اور اگر اولاد ہو تو پھر ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے اس میں جو تم چھوڑو' قرضہ کی ادائیگی اور وصیت کے مطابق عمل کرنے کے بعد۔ اور اگر کوئی مرد یا عورت کلالہ ہو (یعنی اس حال میں فوت ہو کہ نہ تو اس کے والدین زندہ ہوں اور نہ ہی اس کی اولاد ہو) لیکن اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو ان میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے۔ پھر اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں حصہ دار ہوں گے' وصیت پر عمل کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد جب اوروں کا نقصان نہ کیا ہو' یہ حکم ہے اللہ کا' اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور تحمل والا ہے۔"

"کلالہ" کے بارے میں دوسرے حکم (سورۃ النساء' آخری آیت) کے مطابق بھائیوں اور بہنوں کے درمیان وہی قانون لاگو ہو گا جس کا ذکر آیات میراث کے آغاز میں کر دیا گیا' یعنی مرد کے لیے دو حصے اور عورت کے لئے ایک۔ پہلا حکم اخیافی بہن بھائیوں کے بارے میں ہے اور دوسرے میں عینی بہن بھائیوں کا ذکر ہے۔ متذکرہ بالا آیات کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ:

ذلک انہ لما نزلتِ الفرائض التی فرض اللّٰہ فیہا ما فرض لِلوَلدِ الذّکر والانثیٰ والاَبوَین کرھھا النلسُ او بعضُھم وَقالوا: تُعطیٰ المرأۃُ الرّبع او الثمنَ' وتُعطیٰ الِابنۃُ النّصفَ' ویُعطیٰ الغلامُ الصغیر' ولیس مِن ھٰؤلاء احدٌ یقاتل القومَ' ولا یحوز الغنیمۃَ' اسکتوا عن ھٰذا الحدیث لعلّ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم ینساہ او نقول لہ فیغیّر فقالوا: یا رسولَ اللّٰہ تُعطیٰ الجاریۃُ نصفَ ما ترک اَبوھا' ولیست تَرکَبُ الفرسَ' ولا تقاتل القومَ' ویُعطیٰ الصّبیُّ المیراثَ ولیس یغنی

شیئًا (رواہ ابن حاتم وابن جریر ایضًا)(۴)
(ترجمہ) "میراث کے احکام اترنے کے بعد بعض لوگوں نے ناگواری کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ عورت کو چوتھا اور آٹھواں حصہ دلایا جا رہا ہے' او بیٹی کو نصف دلایا جارہا ہے' اور ننھے ننھے بچوں کا حصہ مقرر کیا جا رہا ہے' حالانکہ ان میں سے کوئی بھی نہ لڑائی میں نکل سکتا ہے' نہ مالِ غنیمت لا سکتا ہے۔ اچھا ہو کہ تم اس آیت سے خاموشی برتو' شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بھول جائے' یا ہمارے کہنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان احکام کو بدل دیں۔ پھر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ لڑکی کو اس کے باپ کا آدھا مال ولوا رہے ہیں' حالانکہ نہ وہ گھوڑے پر بیٹھنے کے قابل ہے' نہ دشمن سے لڑنے کے۔ آپؐ بچے کو ورثہ دلا رہے ہیں' بھلا وہ کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے"۔

اسلام چاہتا ہے کہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو جائے۔ وراثت کی تقسیم میں بھی اس اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے' اس لئے صرف بڑے لڑکے یا صرف لڑکوں ہی کو وارث تسلیم نہیں کیا' بلکہ تمام اولاد اور لڑکیاں اور ان کے علاوہ کئی اور رشتہ داروں کو وارث قرار دیا' تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد میں یہ دولت تقسیم ہو۔ یہ وہ تین اصول ہیں (قرابت، ضرورت، تقسیم دولت) جن پر اسلام کا بے نظیر اصول وراثت قائم ہے۔

شریعتِ اسلامیہ کا یہ حکم ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو تجہیز و تکفین کے بعد اس کا قرض ادا کیا جائے' بعد ازاں اسکی وصیت پر عمل کیا جائے۔ (جیسا کہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا : **اِنکم تقرؤن ھذہ الاٰیۃ مِنۡ بَعۡدِ وصِیۃ توصُونَ بِھا اَوۡ دَینٍ وانّ رسولَ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ واٰلہ وسلّم قَضٰی بدینٍ قبلَ الوصیۃ**(۵) چنانچہ عملاً وصیت مؤخر ہے' لفظاً اسکو دَین سے پہلے بیان کیا گیا) اس کے بعد بقیہ ترکہ حسبِ احکامِ قرآنی وارثوں میں تقسیم کیا جائے۔ قرض کی ادائیگی کا مقدم ہونا تو عینِ انصاف ہے۔ وصیت کے بارے میں شریعت نے چند ایک قیود عائد کی ہیں' اور اسلام سے پہلے جو طریقہ وصیت کے بارے میں رائج تھا اس کی اصلاح کر دی' تاکہ اس طریقہ میں جو بے راہ روی رونما ہو چکی تھی اس کا سدباب کر دیا جائے۔(۶)

اس کی دلیل ہمیں سنت نبوی سے بھی ملتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا :

الحقوا الفرائض باهلها(۷) یعنی "میراث پہنچا دو ان کے حقداروں تک"۔

ایک اور حدیث ہے:

اِنَّ اللّٰہ قد اَعطیٰ کلَّ ذی حقٍ حقہ فلا وصیۃَ لوارثٍ(۸)

"اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حصہ عطا فرما دیا ہے' اس لئے اب کسی وارث کے لئے وصیت نہیں"۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ حجتہ اللہ البالغہ میں بڑے دلنشیں انداز میں حصص کی اس تعیین کی حکمت یوں بیان فرماتے ہیں:-

"شرع نے حصصِ میراث کے بارے میں کسور میں سے دو قسم کے مجموعے اختیار کئے ہیں' ایک مجموعہ (الف) ۲/۳ اور ۱/۳ اور ۱/۶ کا ہے' دوسرا مجموعہ (ب) ۱/۲ اور ۱/۴ اور ۱/۸ پر مشتمل ہے۔ ایک سرے سے شروع کرو تو دوگنے ہوتے چلے جاتے ہیں' دوسرے سے ابتداء کرو تو وہ ایک دوسرے کے نصف ہیں۔ ہر ایک مجموعہ میں تین مراتب ہیں' اور ان میں تضعف و تنصیف کا تناسب ہے (۱/۵ اور ۱/۷ کو حصص میراث میں شامل نہیں کیا گیا' کیونکہ ان کی کسر نکالنے میں ذرا دقت ہے)۔

اگر ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہو تو ۲/۳ لڑکے کا اور لڑکی کو ۱/۳' اور اگر سب لڑکیاں ہوں تو ۲/۳ لڑکیوں کا اور باقی ۱/۳ عصبہ کے لئے محفوظ ہے' کیونکہ میت کی بیٹیاں شجرۂ نسب کے عمود کی کڑیاں ہیں' اس لئے حکمت تشریعیہ کا تقاضا ہے کہ ان کو دیا جائے۔ اگر بیٹے اور بیٹیوں کے ساتھ والدین ہوں تو ان کا بھی یہی حال ہے کہ والدین کی نسبت انسان کی اولاد اس کی میراث کی زیادہ حقدار ہے' اس لئے اولاد کا حق ۲/۳ اور (ماں باپ کا حق ۱/۳ ہے) اگر اولاد نہ ہو تو اس کا سارا ترکہ والدین ہی آپس میں **لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ** کے اصول کے مطابق بانٹ لیں گے' اور اگر میت کے بھائی ایک سے زائد ہوں تو ماں کا حصہ گھٹا کر ۱/۶ کر دیا جائے۔ اگر بھائی عَصَبہ نہیں ہے تو پھر نصف ۱/۲ ماں اور اس کی اولاد کا حق ہے۔ (۱/۲ عصبات کو اور ۱/۲ ماں اور اس کی اولاد کا حق ہے) تو لامحالہ ماں کے حصے میں کل کا ۱/۶ آئے گا' اور باقی میں سب شریک ہوں گے۔ اگر میت میں بیٹی اور بیٹے اور شوہر ہوں تو اگر ماں کا حصہ ۱/۶ قرار دیا جائے (بلکہ اس سے زائد دیا جائے) تو یہ ان کے حق میں تنگی اور تکلیف کا باعث ہو گا' **وَلَکُمْ نِصْفُ مَا تَرَکَ اَزْوَاجُکُمْ**

..... مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ' ماں کو اس کے ہاتھ سے نکلنا طبعًا ناگوار گزرے گا۔ نیز وہ (بیوی) خاوند کے مال کی امین ہے' جس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بیوی کے مال میں زبردست حق رکھتا ہے' اور بیوی جو کچھ لیتی ہے وہ اس کا حق خدمت ہے۔ شوہر اور بیوی کا حق مقرر کرنے میں اس بات کا بھی کچھ لحاظ رکھا گیا ہے' اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (ان کی وجہ سے) اولاد کو تنگی اور تکلیف پیش نہ آئے' اس وجہ سے اس کو دوگنا دیا گیا ہے۔ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً الیٰ قولہٖ تعالیٰ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ' اس میں ماں جنے بہن بھائیوں کا حق ہے' اور يَسْتَفْتُونَكَ' قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ الیٰ اُخر الایۃ' یہ صرف باپ کی طرف سے ہوں' ان کے بارے میں آیہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی کا کوئی ایسا قریبی رشتہ دار نہ ہو جو اس کے عمودِ نسب میں داخل ہو' وہ قریبی رشتہ دار جو اولاد سے مشابہت رکھتا ہے اس کا وارث تصور کیا جاتا ہے' جیسے کہ بہن بھائی۔"(۹)

آیتِ میراث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے مسلمان عورتوں پر کتنا بڑا احسان کیا کہ مال اور جائداد کے معاملے میں بھی اس کو نظرانداز نہیں کیا' بلکہ بیوی' ماں' بیٹی اور بہن اپنی اپنی حیثیت میں اپنا حق پاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جہاں اسلام نے ان کو حقوق سے نوازا ہے وہاں ان پر عائد ہونے والے حقوق کو ادا کرنے کا فریضہ بھی عائد کیا ہے' اس فریضہ کی ادائیگی کی صورت میں اجرِ عظیم اور جنت کی بشارت دی ہے۔

۱۔ مفید الوارثین' از سید اصغر حسین

۲۔ Standard Jewish Encyclopaedia, P 962

۳۔ تفسیر معارف القرآن' از مفتی محمد شفیع' ج ۲' ص ۳۲۲

۴۔ تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر' ج ۱' ص ۴۵۸

۵۔ بحوالہ تفسیر معارف القرآن' ج ۲' ص ۳۲۰

۶۔ تفسیر ضیاء القرآن' از پیر محمد کرم شاہ' ج ۲' ص ۳۲۶

۷۔ بحوالہ علم الفرائض و المواریث فی الشریعہ الاسلامیہ والقانون السوری' از مفتی محمد خیری'

۸۔ بحوالہ تفسیر ضیاء القرآن' ج ۲' ص ۳۲۶

۹۔ حجۃ اللہ البالغہ (اردو ترجمہ)' ج ۲' ص ۵۱۶ - ۵۲۰

تواضع اور خاکساری
آیاتِ قرآنی کی روشنی میں

——— مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دہلوی ———

قرآن کریم نے عاجزی اور خاکساری کے لئے تین لفظ استعمال کئے ہیں:

(۱) سب سے زیادہ "خشوع" کا لفظ استعمال کیا ہے' جو تکبر اور غرور کے مقابلہ کا مفہوم رکھتا ہے۔ سورۃ البقرہ (۴۵) میں فرمایا:

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ

"اور وہ (نماز) یقیناً بھاری ہے (شاق ہے) مگر ان پر (آسان ہے) جن کے دل پگھلے ہوئے ہیں"۔

شاہ صاحبؒ نے اس آیت میں قساوتِ قلبی (دل کی سختی) کے مقابلہ میں خشوع کا ترجمہ کیا ہے۔ سورۃ الحدید (۱۶) میں یہ دونوں لفظ ایک آیت میں جمع ہیں:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

"کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ ان کے دل گڑگڑائیں اللہ کے ذکر سے"

اس جگہ "گڑگڑائیں" ترجمہ کیا' یعنی عاجزی اختیار کریں۔

فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ

"لیکن ان پر مہلت کا زمانہ دراز ہو گیا اس لئے ان کے دل سخت ہو گئے"۔

سورۃ الاحزاب (۳۵) میں فرمایا:

اَلْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعٰتِ یعنی "دبے رہنے والے مرد اور دبی رہنے والی عورتیں"

چنانچہ خشوع کا ترجمہ دبنا' یعنی نیچا ہونا کیا — وہی خاکساری کا مفہوم ہے۔

زمین پر بھی خشوع طاری ہوتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ

(حٰمٓ السجدہ: ۳۹)

یعنی زمین دبی پڑی تھی' بارش سے تازی ہو گئی اور ابھر آئی۔ زمین کے خشک ہونے کو خشوع سے تعبیر کیا' کیونکہ یہ اسکی عاجزانہ حالت ہے۔

قیامت کے دن منکرینِ حق پر خشوع طاری ہو گا:

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ○ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ○ (النازعات: ۹)

"اس روز دل دھڑک رہے ہوں گے اور آنکھیں نیچی ہوں گی"۔

وہاں تکبر کی سزا کے طور پر ذلت و شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

(۲) دوسرا لفظ "خضوع" ہے' لیکن قرآن نے یہ لفظ صرف دو جگہ استعمال کیا ہے: **فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ** (الاحزاب: ۳۲) یعنی اے عورتو' نرم اور لوچدار آواز میں گفتگو نہ کرنا' اس سے منافق لوگ بری نیت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ **فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ** (الشعراء: ۴) یعنی اگر ہم چاہیں تو ان پر ان کی فرمائش کے مطابق ان پر نشانی نازل کر دیں' اس وقت ان کی گردنیں شرمندگی سے جھک جائیں گی ---- وہی عاجزی اور جھکنے کا مفہوم ہے۔

(۳) تیسرا لفظ "اِخبات" ہے' اور یہ تین جگہ آیا ہے۔ لغت میں **خَبَتَ** کے معنی مٹ جانا' بے نشان ہو جانا ہے اور قرآن نے اس لفظ کو عاجزی کی آخری منزل' انتہائی حالت کے لئے استعمال کیا ہے' یعنی ایسی عاجزی کہ انسان اپنے وجود اور اپنی خواہشات کو خدا کی مرضی پر قربان کر کے بے نشان ہو جائے:

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ (الحج: ۳۴) "اور خوشی سنا عاجزی کرنے والوں کو"

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (ہود: ۲۳)

"البتہ جو یقین لائے' اور کیں نیکیاں' اور عاجزی کی اپنے رب کی طرف' وہ ہیں جنت کے لوگ"

دونوں جگہ عاجزی ترجمہ کیا ہے۔

فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ (الحج: ۵۴) "دیں اسکے آگے ان کے دل"

اس جگہ دبنا (جھکنا) ترجمہ کیا۔

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

لغات واعراب قرآن (۴۴)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۲۹)

آیات ۴۲ ـــ ۴۴

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳، اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ مبحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۲۹ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ ○ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○

۲ : ۲۹ : ۱ اللغۃ

[و] عاطفہ ہے جو اگلے اور پچھلے جملے کو ملاتی ہے۔ [لَا تَلْبِسُوا] کا مادہ "ل ب س" اور وزن "لَا تَفْعِلُوا" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد مختلف ابواب سے مختلف معانی کے لیے استعمال

ہوتا ہے جن سب میں بنیادی اور مشترک مفہوم "چھپا دینا اور پردہ ڈالنا" کا ہوتا ہے مثلاً

① لبَس . . . . یلبَس لَبْسًا (نصر سے) کے معنی ہیں "... کو اپنے بارے میں شک و اُلجھن میں ڈال دینا" مثلاً "لبَسنِی" "اس نے مجھ کو اپنے (اس کے) بارے میں اشتباہ پیدا کر دیا۔ قرآن میں اس استعمال کی کوئی مثال نہیں ہے۔

② "لبَس . . (۱) . . یلبِس لَبْسًا علی . . (۲) . ." (ضرب سے) آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ". . (۱) . . کو . . (۲) . . پر مشتبہ کر دینا یا . . (۲) . . کے لیے . . (۱) . . میں اشتباہ پیدا کر دینا" مثلاً کہتے ہیں "لبَس الامرَ علیہ" (اس نے اس پر معاملہ مشتبہ کر دیا)۔ قرآن کریم میں اس کی مثال الانعام: ۹ میں ہے۔

③ لبَس . . (۱) . . یلبِس لَبْسًا بِ . . (۲) . . (ضرب سے ہی) آتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں: "(۱) کو (۲) کے ساتھ خلط ملط کر دینا" یا "(۱) کو (۲) کے ساتھ گڈمڈ کر دینا" مثلاً کہتے ہیں: "لبَس الحقَّ بالباطل" (اس نے حق کو باطل سے خلط ملط کر دیا) یہ "ملا دینا" حسی چیزوں (مثلاً سونا اور پیتل یا گندم اور جَو) کی بجائے معنوی چیزوں (مثلاً سچ اور جھوٹ یا صحیح اور غلط) کو ملا جلا دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں یہ فعل ان ہی معنی کے لیے آیا ہے۔ اسی لیے "لاتلبسوا" کا ترجمہ "مت ملاؤ، گڈمڈ نہ کرو، نہ ملاؤ، خلط ملط مت کرو" سے کیا گیا ہے۔

④ "لبِس . . . . یلبَس لُبْسًا" (سمع سے) آئے تو اس کے معنی: ". . . . کو پہننا، پہن لینا" ہوتے ہیں۔ اس کا مفعول پہننے کا کوئی کپڑا (چادر قمیص وغیرہ) آتا ہے مثلاً کہیں گے لبِسَ الثوبَ: (اس نے کپڑا پہنا)۔

● اس فعل کی آخری (مندرجہ بالا) تینوں صورتیں قرآن کریم میں مستعمل ہوئی ہیں۔ قرآن کریم اس فعل مجرد سے فعل کے مختلف صیغے گیارہ[۱۱] جگہ وارد ہوئے ہیں۔ ان میں سے مندرجہ بالا ۲ والے معنی کے لیے چار جگہ ۳ والے معنی کے لیے تین جگہ اور ۴ کے لیے بھی چار جگہ استعمال ہوا ہے۔ عام عربی زبان میں یہ فعل مجرد و مزید فیہ بعض دیگر معانی اور محاورات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اس طرح کا استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا ـــــ البتہ اس مادہ سے ماخوذ بعض اسماء (مثلاً لِباس، لَبُوس اور مصدر لَبْسٌ وغیرہ) دس بارہ جگہ آئے ہیں۔ ان پر حسبِ موقع بحث ہو گی ان شاء اللہ۔

[اَلْحَقَّ] کا مادہ "ح ق ق" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعْلٌ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد (حقّ یحِقّ حقًّا) کے باب معنی اور استعمال پر ـــــ بلکہ خود اس لفظ (الحق) کے معانی وغیرہ پر البقرہ: ۲۶ [۲ : ۱۹ : ۱ (۶)] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔ پچھلے فعل (لاتلبسوا)

کی وجہ سے یہاں "الحقَّ" کا ترجمہ "حق کو، حق میں، سچ کو، سچ میں اور صحیح میں" کے ساتھ کیا گیا ہے۔
۲: ۲۹: ۱ (۲) [بِالْبَاطِلِ] ابتدائی "باء (بِ)" جس کا اردو ترجمہ "کے ساتھ" ہے، کے استعمال و معانی پر استعاذہ کی بحث میں بات ہوئی تھی۔ یہاں یہ "ب" اوپر بیان کردہ فعل (و لا تلبسوا) کے صلہ کے طور پر آئی ہے [دیکھئے ۲: ۲۹: ۱ میں ۳]۔ اور لفظ "الباطل" کا مادہ "ب ط ل" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَاعِلٌ" ہے (جو یہاں باء الجر کی وجہ سے مجرور آیا ہے)

● اس ثلاثی مادہ (بطل) سے فعل مجرد مختلف ابواب سے مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً

① بطَلَ یبطُلُ بُطلاً و بُطلاناً (نصر سے) آئے تو اس کے معنی: "ضائع ہو جانا، ناجائز ہو جانا، بے اثر ہونا اور غلط ثابت ہونا" ہوتے ہیں مثلاً کہتے ہیں "بطَلَ البیعُ" (سودا ناجائز ہو گیا) یا "بطَلَ الدلیلُ" (ثبوت غلط ثابت ہو گیا۔ بے اثر ہو گیا) اور اس چیز کو "باطل" کہتے ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ (باطل) بھی اردو میں مستعمل ہے اس لیے اس فعل کا ترجمہ "باطل ہو جانا یا باطل ثابت ہونا" بھی کر سکتے ہیں۔

② اور اسی باب (نصر) سے "بطَلَ یبطُلُ بَطالةً" (مصدر کا فرق اور اس کی ابتدائی "ب" کا مثلث الحرکات ہونا نوٹ کیجئے) کے معنی "بے کار ہونا، کام (مزدوری، ملازمت وغیرہ) کے بغیر ہونا" مثلاً کہتے ہیں "بطَلَ العاملُ او الاجیرُ" (مزدور بے کار ہو گیا) اس فعل سے اسم صفت "بَطّالٌ" (بے کار، بے روزگار) بنتا ہے۔

③ باب سمع سے "بَطِلَ یبطَلُ بَطالةً" کے معنی ہیں۔ "بات میں غیر سنجیدہ ہونا، فضول بات کرنا" ایسے آدمی کو "بَطِلٌ" کہتے ہیں۔

④ اور "بطُلَ یبطُلُ بُطولةً" (باب کرم سے) آئے تو اس کے معنی "بہادر ہونا، جرأت اور ہمت والا ہونا" ہوتے ہیں۔ اور ایسے آدمی کو "بَطَلٌ" کہتے ہیں جس کی جمع "اَبطال" ہوتی ہے۔

● آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ مذکورہ بالا چاروں معنی کے لحاظ سے یہ فعل ہمیشہ لازم ہی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے صرف ایک صیغہ (فعل ماضی کا) ایک جگہ (الاعراف: ۱۱۷) آیا ہے اور وہ بھی صرف پہلے معنی (غلط ثابت ہونا، باطل ہو جانا) میں استعمال ہوا ہے۔ مذکورہ بالا باقی تین معنی) کے لیے یہ فعل قرآن میں کہیں نہیں آیا ـــــ البتہ مزید فیہ کے باب افعال سے مختلف افعال اور اسمار مشتقہ کے صیغے نو (۹) جگہ آئے ہیں۔ ان کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ کلمہ "الباطل" اسی فعل مجرد کے مذکورہ بالا پہلے معانی (غلط ثابت ہونا) سے اسم

الفاعل ہے۔ بلحاظ معنی یہ کلمہ "حق" کی ضد ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بالعموم "جھوٹ" ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی بے حقیقت، غلط یا نادرست چیز۔ لفظ "حق" کے مختلف معانی البقرہ ۲۶ [۲:۱۹:۱(۶)] میں بیان ہوتے تھے ان کی ضد (مخالف معنی) کے ذریعے "باطل" کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں ویسے لفظ "حق" کی طرح یہ لفظ (باطل) بھی اردو میں اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ مستعمل ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (باطل) مختلف صورتوں میں ۲۶ جگہ وارد ہوا ہے اور زیادہ تر معرف باللام (الباطل) ہی استعمال ہوا ہے۔ پچھلی عبارت (لا تلبسوا الحق) کی وجہ سے یہاں "بالباطل" کا ترجمہ "ناحق کے ساتھ، باطل کے ساتھ، جھوٹ کے ساتھ" کیا گیا ہے۔

[وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ] میں واو عاطفہ (بمعنی اور) کے بعد لفظ "تَكْتُمُوا" ہے جو دراصل "تكتمون" تھا۔ (اس کے آخری "نون" کے گر جانے کی وجہ بحث "الاعراب" میں بیان ہوگی) اس لفظ کا مادہ "ک ت م" اور (موجودہ) وزن "تَفْعَلُوا" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (کَتَمَ ... یکتُمُ کِتمانًا چھپانا پوشیدہ کرنا) کے باب معنی اور استعمال پر البقرہ۔ ۳۳ [۲:۲۳:۱(۳)] میں بات ہو چکی ہے۔

آخری کلمہ "الحق" پر ابھی اوپر [اور ۲:۱۹:۱(۶) میں] بات ہوئی ہے۔

[وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ] "وَ" (جو یہاں حالیہ بمعنی "حالانکہ" ہے) کے استعمالات پر الفاتحہ: ۵ [۱:۴:۱(۳)] اور البقرہ: ۸ [۲:۷:۱(۱)] میں بات ہو چکی ہے۔ "انتم" ضمیر مرفوع برائے جمع مذکر حاضر (بمعنی تم سب) ہے اور "تَعْلَمُوْنَ" کا مادہ "ع ل م" اور وزن "تَفْعَلُوْنَ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد (عَلِمَ ... یعلَمُ: جاننا) کے باب اور معنی وغیرہ پر الفاتحہ: ۲ [۱:۲:۱(۴)] نیز البقرہ: ۱۳ [۲:۱۰:۱(۳)] میں مفصل بات ہو چکی ہے ـــــ یہاں ابتدائی "واو" کے حالیہ ہونے کی وجہ سے اس عبارت (وانتم تعلمون) کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "درانحالیکہ یا حالانکہ تم جانتے ہو / جان رہے ہو" ـــــ بعض نے تاکید کے لیے (اردو محاورے کے مطابق) "جان بھی رہے ہو" سے ترجمہ کیا ہے۔ جب کہ اکثر نے اس جملہ (حالیہ) کا بامحاورہ اردو ترجمہ "جان کر، جان بوجھ کر، دیدہ و دانستہ" کی صورت میں کیا ہے ان سب میں "حال" کا مفہوم موجود ہے۔

[وَاَقِيْمُوْا] کی ابتدائی "واو" عاطفہ ہے اور "اَقِيْمُوْا" کا مادہ "ق و م" اور وزن اصلی "اَفْعِلُوْا" ہے۔ اس کی اصلی شکل "اَقْوِمُوْا" تھی جس میں حرف علت (و) کی حرکت (ـِ) ماقبل حرف صحیح (ق) کو دے کر خود اس واو کو ماقبل کی حرکت کسرہ (ـِ) کے موافق حرف (ی) میں بدل کر لکھتے اور بولتے ہیں اب اس (اقیموا) کا وزن (تعلیل کے بعد) "اَفِيْلُوْا" رہ گیا ہے۔

یہ فعل (اقیموا) اس مادہ (ق و م) سے باب افعال کے فعل "اَقَامَ يُقِيْمُ اِقَامَةً"

(دراصل اَقْوِمُوا یُقْوِمُ اِقْوامًا) بمعنی" قائم کرنا" سے فعل امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس باب سے فعل امر کی گردان (تعلیل کے بعد) "اَقِمْ ، اَقِیْمَا ، اَقِیْمُوْا ، اَقِیْمِیْ ، اَقِیْمَا اور اَقِمْنَ" ہو گی ـــــ اس مادہ (قوم) سے فعل مجرد اور خود اس باب (اِفعال) کے فعل (اَقامَ یُقِیْمُ) کے معانی و استعمالات پر البقرہ: ۳ [۲:۲:۱ (۳)] میں مفصل بات ہو چکی ہے ـــــ "اَقِیْمُوا" کا لفظی ترجمہ "قائم کرو/رکھو" بنتا ہے۔ جس کی بامحاورہ صورتوں سے بھی مذکورہ بالا مقام (۲:۲:۱(۳)) میں کلمہ "یقیمون" کے ضمن میں بحث کی گئی تھی۔

[الصَّلٰوةَ] کے مادہ، وزن اصلی، فعل مجرد وغیرہ کے معانی اور لفظ صلٰوۃ کے "نماز" کے مترادف و ہم معنی ہونے پر بھی البقرہ: ۳ [۲:۲:۱ (۴)] میں بالتفصیل بحث گزر چکی ہے اور "اقامة الصلٰوۃ" کے معنی اور اس کے مختلف تراجم کا ذکر بھی وہیں کیا جا چکا ہے۔

۲:۲۹:۱(۳) [وَاٰتُوْا] میں ابتدائی واوِ عاطفہ کے بعد والے کلمہ "اٰتُوْا" کا مادہ "ا ت ی" اور وزن اصلی "اَفْعِلُوْا" ہے۔ اس کی اصلی شکل "أَأْتِیُوْا" تھی۔ اس کے ابتدائی حصے میں تو ایک متحرک اور ایک ساکن ہمزہ کے جمع ہونے کی بنا پر "أَأْ = آ" بن گیا (اس کے قرآنی ضبط پر آگے بات ہو گی) ـــــ اور اس (آتِیُوْا) کا آخری حصہ (تِیُوْا) ناقص کے واو الجمع والے قاعدے" کے مطابق "تُوْا" میں بدل جاتا ہے اور یوں یہ لفظ "آتُوْا" بنتا ہے۔ اس مادہ (ا ت ی) سے فعل مجرد (اَتٰی یَأْتِی اتیانًا = آنا) کے باب معنی اور استعمال پر البقرہ: ۲۳ [۲:۱۷:۱(۴)] میں بات ہوئی تھی۔

● زیرِ مطالعہ کلمہ (آتُوْا) اس مادہ سے باب افعال کا فعل امر صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ باب افعال سے اس فعل "آتٰی ۔ ۔ ۔ یُؤْتِیْ ایتاءً"[1] (دراصل أَأْتَیَ یُؤْتِیُ إِئْتَایًا") کے بنیادی معنی ہیں "۔ ۔ ۔ ۔ کو ۔ ۔ ۔ ۔ دینا" ـــــ یعنی عمومًا اس کے دو مفعول اور دونوں براہِ راست (بنفسہ) آتے ہیں۔ ① جس کو دیا جائے اور ② جو چیز دی جائے جیسے "آتاہ اللّٰہُ الملکَ" (البقرۃ: ۲۵۱) یعنی اللہ نے اس کو حکومت دی"۔ بعض دفعہ اس کا ایک مفعول محذوف ہوتا ہے پھر اس کی بھی دو صورتیں ہیں ① زیادہ تر تو پہلا مفعول (جس کو دیا جائے) محذوف ہوتا ہے۔ اس کی قرآن کریم میں تیئس

[1] اس مادہ سے باب مفاعلہ کا فعل "آتٰی یُؤاتی مُؤاتاۃً" بھی عربی میں "موافقت کرنا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "آتَی فلانًا علی الامرِ" (اس نے فلاں کے ساتھ معاملے میں موافقت کی) تاہم یہ استعمال قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ صرف "آتٰی" کی مشابہت کے باعث ہم نے اس کا ذکر کیا ہے۔ باب افعال والا "آتٰی" اَفْعَلَ سے اور باب مفاعلہ "آتٰی" دراصل "فَاعَلَ" ہوتا ہے۔

سے زیادہ مثالیں موجود ہیں۔ (۲) اور بعض دفعہ دوسرا مفعول (جو چیز دی جائے) محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے۔ اس کی صرف ایک مثال قرآن کریم (النور: ۲۲) میں آئی ہے۔

● کبھی اس فعل (آتَی یُؤْتِی) کے معنی، موقع کے لحاظ سے، "لانا۔ لے آنا" بھی ہوتے ہیں جو در اصل "دینا" ہی کی ایک صورت ہے مثلاً کہتے ہیں "آتی زیدٌ اطعامًا" (وہ زید کے سامنے کھانا لایا) اور قرآن کریم میں ہے "آتِنا غَدَاءَنَا" (الکہف: ۶۲) جب اس فعل کا مفعول (ثانی) "زکوۃ" یا کوئی واجب شرعی ہو تو اس کا ترجمہ "ادا کرنا" سے بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں باب افعال کے اس فعل (آتی یؤتی) سے افعال اور اسماء مشتقہ کے مختلف صیغے ۲۷۵ کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔

● یہاں اس (آتوا) کا ترجمہ "دو" کے علاوہ "دیا کرو" اور "دیتے رہو" سے بھی کیا گیا ہے جو تفسیری ترجمہ ہے یعنی اس میں کئی بار یا بار بار (ہر سال) زکوٰۃ ادا کرنے کا مفہوم ہے۔ جس کا ثبوت سنت سے ملتا ہے۔

۲: ۲۹: ۱ (۴) [الزَّکٰوۃَ] کا مادہ "زک و" اور بقول بعض[1] "زک ی" ہے اور وزن اصلی (لام تعریف نکال کر) "فَعَلَۃٌ" ہے (جو یہاں منصوب ہے) گویا اس لفظ کی اصلی شکل "زَکَوَۃٌ یا زَکَیَۃٌ" تھی جس میں "واو یا یاء" ماقبل مفتوح الف میں بدل جاتی ہے اور یوں یہ لفظ "زکاۃ" بنتا ہے جس کی قرآنی املاء (رسم عثمانی) "زکوٰۃ" ہے۔ جو ایک طرح سے اس بات پر دلیل بھی ہے کہ اس کا مادہ واوی اللام ہے جس میں الف میں بدلنے والی "واو" کو لکھنے میں برقرار رکھا گیا ہے اگرچہ اسے پڑھا "الف" ہی جاتا ہے۔ لفظ "صلوۃ" کے بارے میں بھی یہی بات آپ پڑھ آئے ہیں۔ [دیکھئے ۲: ۲: ۱ (۴)]

● اس مادہ سے فعل مجرد زیادہ تر "زکا یزکو زکاءً (دراصل زَکَوَ یَزْکُوُ) باب نصر سے آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں "بڑھنا، نشوونما پانا، زیادہ ہونا" ــــ اور یائی اللام مادہ کی صورت میں یہی فعل باب سمع سے "زَکِیَ یزکی زکیً" بھی اسی معنی کے لیے مستعمل ہے۔ ویسے یہ باب (سمع) واوی اللام سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ "زکِوَ یزکَوُ" بھی (رضِیَ کی طرح) پڑھا تو "زکِیَ یزکی" ہی جائے گا اور اگر یائی اللام ہی ہو تو بھی (خَشِیَ یخشٰی کی طرح) پڑھا زکِیَ یزکی جائے گا۔

● عربی زبان میں مذکورہ بالا معانی کے علاوہ یہ فعل (زکا یزکو) بعض دوسرے معانی (مثلاً نیک

---

[1] مثلاً الفیروز آبادی (القاموس المحیط)۔

ہونا، پاکیزہ ہونا، عمدہ حالت میں ہونا وغیرہ) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ فعل ہمیشہ لازم ہی آتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ (یا ان دونوں مادوں سے) ثلاثی مجرد کا کوئی فعل (کسی معنی میں بھی) کہیں نہیں آیا۔ البتہ اس سے مشتق اسماء صفت (زکی، زکیۃ اور ازکیٰ) پانچ چھ جگہ وارد ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے ابواب تفعیل اور تفعل سے افعال کے مختلف صیغے بھی بیس کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔ ان پر حسبِ موقع بات ہوگی ان شاء اللہ العزیز۔

● زیرِ مطالعہ لفظ "الزکوۃ" اپنے مادہ سے فعل مجرد کا مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ یعنی اس کے معنی "بڑھنا، نشوونما پانا، زیادہ ہونا، پاکیزگی والا ہونا" بھی ہو سکتے ہیں اور "برکت، نشوونما، بڑھوتری، پاکیزگی، عمدگی" وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں دو جگہ (الکہف: ۸۲ اور مریم: ۱۲) یہ لفظ بصورت نکرہ "زکوۃً" اپنے ان ہی لفظی معنی کے ساتھ (بطور مصدر یا اسم) آیا ہے۔ باقی قریباً تیس مقامات پر یہ لفظ معرف باللام ہو کر (الزکوۃ) استعمال ہوا ہے۔ اور یہ لامِ تعریف ہی اس لفظ کو معہود ذہنی کے طور پر ایک خاص معنی دیتا ہے۔

● اس طرح یہ لفظ "الزکوۃ" بھی "الصلوۃ" [۲ : ۲ : ۱ (۴)] اور "الآخرۃ" [۲ : ۳ : ۱ (۵)] کی طرح ایک اسلامی اصطلاح ہے جو اسلام نے عربی زبان کو دی ہے۔ اس کا اطلاق اس مالی عبادت پر ہوتا ہے جو مسلمانوں پر فرض ہے، جو اسلام کے پانچ بنیادی فرائض میں سے ایک ہے اور جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً نافذ فرما کر اس کے پورے اصول و ضوابط اور اس کے متعلق جملہ احکام (نصاب، شرح وغیرہ) کی تفصیلات بذریعہ تحریر و تقریر واضح فرمادیں۔ اور جو اپنے اسی اصل عربی نام (الزکوۃ) کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک تمام مسلم معاشروں میں رائج، متعارف اور جانی پہچانی اصطلاح ہے[1] اس لیے کسی مترجم نے بھی اس کا لفظی ترجمہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی بلکہ سب یہی لفظ استعمال کرتے ہیں اور "آتوا الزکوۃ" کا ترجمہ "زکوۃ دو، زکوۃ دیا کرو، زکوۃ دیتے رہو" سے ہی کیا ہے۔ مگر بعض منکرین سنت کو پوری اُمت اور اس کے ہر مکتبِ فکر کا ایک اصطلاح پر اتفاق صرف اس لیے "چبھا" ہے کہ "زکوۃ" کے ان اصطلاحی معنی اور احکام کا منبع اور مصدر سنتِ رسول ہے۔ اس لیے انہوں نے "آتوا الزکوۃ" کا "مفہوم" یوں بیان

---

[1] قرآن کریم کی بہت سی اصطلاحات کے فارسی مترادفات مشرقی اسلامی ممالک میں رائج ہو گئے ہیں اور اب یہ الفاظ اپنے اصل فارسی مفہوم کی بجائے قرآنی اور اسلامی اصطلاح کے بالکل ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اللہ کے لیے خدا، صلوۃ کے لیے نماز، صوم کے لیے روزہ، جنت کے لیے بہشت، جہنم کے لیے دوزخ، ملک کے لیے فرشتہ وغیرہ۔ تاہم بعض اصل قرآنی اصطلاحات ہی متعارف ہیں۔ ان میں سے ہی آخرت، حج اور زکوۃ ہیں۔ کسی اسلامی ملک اور اسلامی معاشرے میں ان لفظوں (اصطلاحات) کا ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تشریح اور وضاحت الگ چیز ہے۔

کیا ہے: "نوع انسان کی نشوونما کا سامان فراہم کرو" جو سوشلزم کے رائج الوقت روٹی، کپڑا اور مکان کے دلفریب نعرہ اور نظریات کی روشنی میں خاصا "چمکیلا" مفہوم ہے۔ مگر دالستہ یا نادالستہ دین کا حلیہ بگاڑنے اور اُمت کے اتفاق کو افتراق میں بدلنے کی کوشش ہے۔ البتہ کولبس بننے کی خواہش کی تسکین کا سامان ضرور ہے۔

۲ : ۲۹ : ۱ (۵) وَارْكَعُوا میں واو عاطفہ (وَ) کے بعد لفظ "ارکعُوا" ہے (جس کا ابتدائی ہمزۃ الوصل "واو" کے ساتھ ملنے کی بنا پر تلفظ سے ساقط ہوگیا ہے) اس (ارکعوا) کا مادہ "رک ع" اور وزن "اِفْعَلُوا" ہے۔

اس مادہ سے فعل مجرد "رَکَعَ یرکَعُ رُکوعاً (فتح سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "جھکنا یا جھک جانا" ہیں۔ چاہے اپنے ارادے سے سر یا بدن کو نیچے جھکایا جائے یا آدمی بڑھاپے وغیرہ کی وجہ سے (کمر دوہری ہوکر) جھک جائے۔ محاورے میں یہی فعل "مالی لحاظ سے پستی میں جانا" یعنی امیری کے بعد غریب ہوجانا" اور "تواضع اور عاجزی اختیار کرنا" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ فعل کبھی "الی" کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے مثلاً "رَکَعَ اِلَی اللّٰہِ" کے معنی ہیں "اللہ کی طرف جھکنے میں سکون پانا"۔

● یہ تو اس فعل کے لفظی معنی تھے۔ مگر اس فعل کو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص اصطلاحی معنی دیئے۔ بلکہ اس سے نماز کے لیے دو اصطلاحیں اخذ کی گئیں۔ یعنی "رکوع اور رکعت" (جس کی عربی املا "رکعۃ" ہے) ـــــ لفظ رکوع تو اس فعل مجرد کا مصدر ہے جس کے معنی "جھکنا" ہی ہیں۔ اور کلمہ "رکعۃ" اس فعل سے مصدر المرّۃ (جس میں فعل والے کام کے "ایک بار" ہونے کا مفہوم ہوتا ہے) ہے یعنی اس کا مطلب "ایک بار جھکنا" ہے۔ مگر اب بطورِ اصطلاح "رکوع" نماز کے اندر اختیار کی جانے والی ایک خاص ہیئت ہے جب قیام کے بعد نمازی اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی پیٹھ اور سر کو افقی حالت میں زمین کے متوازی لاتا ہے اور اسے حالتِ رکوع کہتے ہیں۔ اپنے ان ہی اصطلاحی معنی کی بنا پر فعل "رکع یرکع" کا ترجمہ "رکوع کرنا" بھی کیا جاسکتا ہے ـــــ اور "رکعت" (یا رکعۃ) نماز کے ایک خاص حصّے کا نام ہے کیونکہ اس میں ایک بار جھکنے یا رکوع کرنے کا عمل شامل ہوتا ہے۔ لفظ "رکعۃ" قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا مگر فعل "رَکَعَ یرکَعُ" کے مختلف صیغے پانچ جگہ اور اس سے مشتق مختلف اسماء چھ جگہ آئے ہیں۔

مَعَ الرّٰكِعِيْنَ اس میں "مَعَ" دو حرفی مادہ کا ایک اسم ہے (جسے بعض عرب قبائل "مَعْ" بھی بولتے ہیں)۔ یہ ظرف (زمان و مکان) کا کام دیتا ہے یعنی جگہ اور وقت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس میں دو چیزوں کے "ایک ہی جگہ یا ایک ہی وقت میں باہم ساتھ ہونے اور

اکٹھا ہونے" کا مفہوم ہوتا ہے۔ عموماً یہ لفظ (ہر ظرف کی طرح) مضاف ہو کر آتا ہے جیسے "مَعَکُم" (تمہارے ساتھ ایک ہی جگہ) اور "مع العصرِ" (عصر کے وقت کے ساتھ ہی) ـــــ اور کبھی یہ لفظ مضاف ہوئے بغیر بطور حال نکرہ منصوب ہو کر استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "خرجنا معًا" (ہم ساتھ ہی بیک وقت نکلے)۔ یہ دوسرا استعمال (معًا والا) قرآن کریم میں نہیں آیا۔ البتہ مضاف ہو کر کسی جگہ استعمال ہوا ہے اور اس کا ترجمہ "... کے ساتھ، ... کے ہمراہ" (ایک ہی جگہ یا ایک وقت میں) کے ساتھ ہی کیا جا سکتا ہے۔

● کلمہ "الراکعین" کا مادہ "ر ک ع" اور وزن (لام تعریف کے بغیر) "فاعلین" ہے۔ یعنی یہ لفظ ابھی اوپر بیان کردہ فعل مجرد "رَکَعَ یرکَعُ" سے اسم الفاعل کا صیغہ جمع مذکر سالم ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ "رکوع کرنے والے، عاجزی کرنے والے یا جھکنے والے" ہوگا۔ اسی لیے اس آخری حصّہ آیت (وارکعوا مع الراکعین) کا لفظی ترجمہ "اور تم جھکو ساتھ جھکنے والوں کے"۔ جس کے لیے سلیس عبارت "جھکنے والوں کے ساتھ جھکو" اور "عاجزی کرنے والوں کے ہمراہ عاجزی کرو" اختیار کی گئی ہے اور اسی کا اصطلاحی ترجمہ "رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو" کیا گیا ہے جس میں نماز باجماعت کا مفہوم موجود ہے۔ بعض مترجمین نے فعل امر میں استمرار کا مفہوم پیدا کرنے کے لیے (کہ نماز بار بار پڑھی جاتی ہے) "جھکا کرو اور جھکتے رہو" سے ترجمہ کیا ہے۔ جو نماز "ادا کرنا" کی مناسبت سے تفسیری ترجمہ ہے۔ اور بعض نے تفسیر کے لیے ترجمہ ہی "نماز میں جھکنے والوں کے ساتھ جھکو" کر دیا ہے جو رکوع کے اصطلاحی معنی کی بنا پر ہی درست کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ لفظ سے تو ہٹ کر ہے۔

● اگرچہ یہاں لغوی معنی "جھکنا، عاجزی کرنا" بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ تاہم "مَع" میں "ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں" اکٹھے (یہ) کام کرنے کا جو مفہوم ہے نیز اس سے پہلے "اقیموا الصلوٰۃ" اور "آتوا الزکوٰۃ" کے خالص اصطلاحی الفاظ آتے ہیں۔ اس لیے یہاں "وارکعوا مع الراکعین" کے اصطلاحی معنی مراد لینا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ جس سے دوسرے لفظوں میں "باجماعت نماز پڑھنے" کی تاکید مراد لی جا سکتی ہے۔

● چونکہ ان تمام اصطلاحات (رکوع۔ راکع۔ رکعت وغیرہ) کی بنیاد سنتِ رسولؐ ہے۔ اور پوری امت (جزوی اختلافات کے باوجود) اصل نماز اور اس کے ارکان (قیام۔ رکوع۔ سجود وغیرہ) کو جانتی اور سمجھتی ہے۔ شاید اسی "اتفاق" کو ناپسند کرتے ہوئے یہاں بھی منکرین سنّت نے بڑی خوبصورتی سے ڈنڈی مارنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی اس حصۂ آیت (وارکعوا مع الراکعین) کا "مفہوم" یوں بیان کیا ہے "تم بھی ان کے ساتھی بن جاؤ جو قوانینِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں" ـــــ جس سے بظاہر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ گویا اس حکم کا ارکانِ نماز سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ حالانکہ عبارت میں دونوں (لفظی اور اصطلاحی) معنی مراد لینے کی گنجائش موجود ہے۔ (جاری ہے)

خطوط و نکات

دہلی سے مولانا سیّد اخلاق حسین قاسمی کا مکتوب

کرامی قدر حضرت ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

امید ہے کہ آنجناب اور دوسرے اعزّہ و احباب بخیر ہوں گے۔

آنجناب کو براہ راست فون پر زحمت دی' ایک معمولی کام کے لئے' معذرت خواہ ہوں' لیکن مدت کے بعد اسی بہانے سے چند منٹ ملاقات ہو گئی' غنیمت ہے۔ کیبل ٹی وی والے کبھی کبھی آپ کا درس قرآن سنا دیتے ہیں' وہ بھی ملاقات ہی ہے۔ اب ایک نجی کام سے پاکستان آنا ہے' ابھی وقت لگے گا' خدا کرے اس وقت تک ویزا کے ملنے میں کوئی سہولت ہو جائے' ورنہ تین ماہ لگتے ہیں۔ چکر لگاتے رہو' بڑے دھکے کھانے کے بعد ویزا مل جاتا ہے۔

آپ کے بعض اہم تبصرہ اور میثاق کے مضامین 'قومی آواز' میں شائع کراتا رہتا ہوں اور مقصد یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے اندر صلح صفائی کے پہلو بھی سامنے آتے رہیں' ورنہ کش مکش تو انتہاء پر ہے۔ یہاں بابری مسجد کے بعد مسلم قائدین کی جو درگت بنی ہے بس شرم آتی ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے۔ ناکامی ہو جانی' کوئی شرم کی بات نہیں لیکن امام صاحب سے لیکر شہاب الدین صاحب تک پورے حلقۂ قیادت کے اندر جو شرمناک کمزوریاں کھل کر آرہی ہیں اور ایک دوسرے کی جس طرح نقاب کشائی کر رہا ہے وہ پوری ملت کے لئے باعثِ شرم ہو گیا ہے۔

بمبئی کانڈ سے فرقہ پرستی پر سکوت طاری ہو گیا تھا لیکن حکومت نے اس کے جواب میں "اسرائیل کا دورہ کرایا اور اس سے بھائیوں کے خلاف باتیں کہلوائیں جس سے مسلمانوں کے اندر کی خوشی خوف میں بدل گئی۔

پاکستان جو کچھ کر سکتا ہے وہ کر رہا ہے لیکن کشمیری مسلمان جس بے دردی کے ساتھ کچلا جارہا ہے آخر اس قربانی کی بھی ایک حد ہے۔ اور دہشت گردی ایک مقامی منظم فوج کے مقابلہ میں' جیسا کہ آپ نے لکھا ہے' کیسے کامیاب ہو گی۔

آپ نے ٹھیک ہی نوٹ لکھا ہے کہ قوت و طاقت کے تصور سے بُعد پیدا ہو گیا ہے۔ بُعد کیا وحشت پیدا ہو گئی ہے۔ ابھی ایک اسلامی جماعت کے نوجوان گروپ نے ملی کونسل بنائی اور قیادت کے خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی اور فنڈ کی وصولی کے لئے خلیج کے دورے کئے اور الجہاد فی الہند کے نعرے لگائے۔ کئی کروڑ روپیہ وصول کر لائے مگر جب مولانا ندوی کو ان کے

آدمیوں نے لکھا کہ آپ کے نام پر یہ ہو رہا ہے تو فوراً پرسنل لاء بورڈ کی میٹنگ بلا کر اس گروپ کو بے اثر کیا گیا۔ ورنہ بمبئی کے بعد بیرونی فنڈ کی تحقیقات میں ندوہ بھی گردش میں آ جاتا۔ بمبئی کے بااثر مسلمان تو گردش میں آئے ہوئے ہیں۔ آپ بتائیں کہ قوت کے اس احمقانہ تصور کے تباہ کن نتائج دیکھ کر بھی قوت سے وحشت نہ ہو! اور یہ سب کچھ للّٰہیت سے نہیں' دولت کمانے اور حلقہ کی پرورش کرنے کی غرض سے۔

بہرحال دعا کا طالب ہوں' ان شاء اللہ سردیوں میں ملاقات ہو گی۔

والسلام

اخلاق حسین قاسمی

علامہ شبیر بخاری کا مراسلہ

523 جہاں زیب بلاک

علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

مورخہ 5/ جون 1993

عزیز محترم سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون! مضمون کی پانچ کاپیاں موصول ہوئیں۔ آپ کی عنایت کا ممنون ہوں۔

عزیز القدر پروفیسر ظفر علی قریشی نے ایک ریفرنس کی مزید وضاحت چاہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اور قارئین کو بھی اس Reference کی تشنگی کا احساس ہوا ہو' اس لئے صراحتاً تحریر خدمت ہے کہ حکمت قرآن شمارہ اپریل ۱۹۹۳ء صفحہ ۸۹ کی آخری دو سطور اس طرح ہیں:

All those that have come in place of me are thieves and plunderers....

یہ سطور New World Translation of the Holy Scriptures کے صفحہ نمبر 1165 پر درج ہیں۔ یہ کتاب 1961 میں

Watch Tower Bible and Tract Society of New York (Inc)

نے نیو ورلڈ بائبل ٹرانسلیشن کمیٹی نیویارک کے مقدمے کے ساتھ (محررہ 17/ جنوری 1961) کو شائع کی۔ اس کا ایک نسخہ مخدوم جہانیاں اکیڈمی کی لائبریری میں موجود ہے جس کے منصرم سید احمد رضا اور محمد رضا بخاری ہیں۔

امید ہے سب مع الخیر ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلامِ رحمت

مخلص

شبیر بخاری عفی عنہ

تعارف و تبصرہ

محمد سعید الرحمٰن علوی

○ خطوطِ سلیمانی' مرتب: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

صفحات ۲۷۲' ملنے کا پتہ: مکتبہ شاہد' ۹ر علی گڑھ کالونی کراچی نمبر ۴۱

علامہ سید سلیمان ندوی کا نام اس خطہ کے کسی بھی شخص کے لئے اجنبی نہیں۔ علامہ شبلی کے نامور علمی جانشین' ان کے چھوڑے ہوئے ادھورے کام بہ سلسلہ سیرت النبی کی تکمیل کرنے والے' ندوہ جیسی مثالی درسگاہ کے منتظم اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کو چار چاند لگانے والے اور آخر میں حضرت تھانویؒ کے دامنِ عقیدت سے وابستہ ہو کر دل کی دنیا بسانے والے سید صاحبؒ زندگی کے آخری ایام میں حکومت پاکستان کی خواہش پر پاکستان آگئے تاکہ اس ملک کے اسلامی تشخص کے لئے کام کر سکیں۔ اس سلسلہ میں انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کہ یہاں کی قیادت اس حوالہ سے مخلص نہ تھی۔ سید صاحب اتنے دل برداشتہ تھے کہ انہیں صحت کے روگ نے آلیا اور وہ کراچی میں جان ہار گئے۔

سید صاحب مولانا ابوالکلام سے لے کر علامہ اقبال تک کی بزم کے رفیق تھے' جمعیۃ علماءِ ہند کے سٹیج پر بھی کام کیا۔ وفدِ خلافت میں یورپ گئے تو شاہ سعود کی بلائی گئی مؤتمر میں بھی ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اس قسم کے ہمہ گیر انسان کی زندگی میں مکاتیب و خطوط کا سلسلہ وافر مقدار میں ہوتا ہے' اسے خود بھی لکھنا پڑتا ہے اور لوگ بھی اس سے رابطہ کرتے ہیں۔ سید صاحب کے نام علامہ اقبال کے خطوط کا ایک مجموعہ سامنے آچکا ہے جبکہ اور کئی مجموعے چھوٹے بڑے ادھر ادھر سامنے آئے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے جو تن تنہا ایک اکیڈمی کا کام کر رہے ہیں' حال ہی میں سید صاحب کے مکاتیب (جو انہوں نے لکھے) کے دو مجموعے مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے سید صاحب کے خطوط و مکاتیب کا ایک بڑا مجموعہ فراہم کیا' جو بکھرا ہوا تھا اور "مکاتیبِ سلیمانی" اور "خطوطِ سلیمانی" کے عنوان سے انہیں مرتب کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخر الذکر آپ کے سامنے ہے جس میں مرحوم کے علمی' ادبی' تاریخی اور نج کے خطوط ہیں' جبکہ اول الذکر مجموعہ میں ان کے عالمانہ' محققانہ اور عارفانہ مکتوبات ہوں گے۔ اس مجموعہ میں ان کے مختصر حالات پر فاضل مرتب کا ایک جامع مقالہ ہے اور پھر ۳۴ حضرات کے نام مکاتیب ہیں۔

ان مکاتیب الیہم میں نواب شروانی' اکبر شاہ نجیب آبادی' عبدالعزیز میمن' ڈاکٹر سید عبداللہ' مولانا محمد عرفان' مولانا غلام رسول مہر' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اور عبدالرزاق کان پوری جیسی شخصیات شامل ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مکاتیب کس شان کے ہوں گے۔ مکاتیب میں سے بعض پر سید صاحب یا ان کے خدام کے حواشی ہیں تو بعض پر فاضل مرتب کے' تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔ ان مکاتیب میں ۱۹۱۴ء سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک کے مکاتیب شامل ہیں۔ یوں گویا ان سے نصف صدی کے بہت سے حالات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور بہت سی تاریخی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں جبکہ علمی مسائل بھی حل ہوتے نظر آتے ہیں۔

فاضل مرتب نے آخر میں مکاتیب الیہم کا مختصر تعارف بھی کرا دیا ہے تاکہ قارئین سید صاحب کے مکاتیب الیہم سے واقف ہو کر ان خطوط کا مطالعہ کر سکیں کہ اس سے معاملہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ صاف ستھرا مجموعہ انتہائی وقیع اور لائق مطالعہ ہے۔ امید ہے کہ اصحابِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔

○ **نقوشِ حقانی' تالیف: حافظ محمد ابراہیم فانی**

ملنے کا پتہ: دارالعلوم حقانیہ' اکوڑہ خٹک (نوشہرہ) سرحد

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ہمارے ملک کا ایک معیاری ادارہ ہے۔ اس کے بانی مولانا عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ اس اعتبار سے بہت ہی خوش قسمت تھے کہ انہیں زندگی کے ہر میدان میں نہایت قابل طلبہ کی کھیپ ملی۔ تدریس' تصنیف' جہاد' الغرض ہر میدان میں ان کے گرامی قدر شاگردوں نے اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑے۔

مولانا کے آخری دور کے شاگردوں میں مولانا عبدالقیوم حقانی ایک معروف عالم ہیں۔ کم عمر' لیکن خدمت کے اعتبار سے معمر۔ حیرانی ہوتی ہے کہ اس عزیز نوجوان نے تدریس' خطابت اور ایسی ہی ذمہ داریوں کے ساتھ اتنا بڑا تحریری کام کیسے کر لیا! یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا کرم' مولانا عبدالحق کی تربیت اور عزیز موصوف کی ذاتی محنت کا ثمرہ ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بہت ہے اور ملک کے اکثر علمی رسائل ان پر جاندار تبصرے کر چکے ہیں۔ حقانی صاحب کے ایک علمی عزیز مولانا محمد ابراہیم فانی نے ۱۸۰ صفحات کی اس کتاب میں حقانی صاحب کی تصانیف کا اس طرح جائزہ لیا ہے کہ حقانی میاں کا پورا علمی سرمایہ ایک نظر میں سامنے آجاتا ہے۔ ہمارے ناقص خیال میں فانی صاحب کی یہ ایک اپنی سی کوشش ہے اور بڑی کامیاب' جس کے ذریعہ آپ بہت سی معلومات سے یک نظر آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر آپ کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔ کتاب کا طباعتی معیار بھی اچھا ہے۔

بقیہ: تواضع اور خاکساری

عاجزی قرآن میں!

عجز کے معنی لغت میں لاچار اور مجبور ہونا ہے اور قرآن نے اسی مفہوم میں اسے استعمال کیا ہے:

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (الانعام: ۱۳)

"اے کافرو! تم اپنی سرگرمیوں سے خدا کو عاجز اور مجبور نہیں کر سکتے"۔

اسی سے عجوز (بڑھیا عورت) ہے' اعجاز اور معجزہ بھی اسی مادہ سے آتا ہے۔ اردو والوں نے اس لفظ کو تواضع اور خاکساری اور مجبوری دونوں معنی میں استعمال کیا ہے۔ ورنہ اصل زبان میں "عاجز" مجبور کو کہا جاتا ہے' متواضع شخص کو نہیں۔ اردو میں "انکسار" بھی عاجزی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ لغت عربی میں کسر توڑنا' اور انکسار ٹوٹنا ہے اور اسی سے عاجزی کے معنی پیدا ہوئے۔ قرآن میں یہ لغت بالکل نہیں ہے۔

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت

ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب بزبان انگریزی

TURMOIL IN THE MUSLIM UMMAH TODAY

آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کی صورت میں دستیاب ہے

(یہ خطاب ان متعدد خطبات اور لیکچرز میں سے ایک ہے جو ڈاکٹر صاحب نے حالیہ دورۂ امریکہ کے دوران بزبان انگریزی وہاں مختلف شہروں میں دیئے)

آڈیو کیسٹ - /40 روپے میں (سی - 60 کے دو کیسٹ پر مشتمل) اور ویڈیو کیسٹ - /150 روپے میں حاصل کئے جاسکتے ہیں

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور 36 - کے' ماڈل ٹاؤن

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں عملی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

چھپ کر آگئی ہے ــــ ضرور مطالعہ کیجئے ــــ دوسروں تک پہنچائیے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلّد -/۸۰ روپے ■ غیر مجلّد -/۶۰ روپے